سرد شعلے

جی۔ ایم۔ ناز

ناشر
اِدارہ نفسیات پوسٹ بکس ۴۴۵ کراچی ۳

بارِ اول ۲۰۰۰ نومبر ۱۹۴۹ء

قیمت دو روپیہ (پاکستانی)

مہتمم ادارۂ نفسیات نے الصاف پریس سے چھپوا کر دفتر ادارہ نفسیات صدر کراچی سے شائع کیا

کتبہ محمود

مُندرجات

افسانے

اِنتساب

سلمیٰ کے نام

ناز

نازؔ کے افسانے میری نظر میں

اس سے قبل کہ نازؔ کے افسانوی مجموعہ "سرد شعلے" کے متعلق اظہار خیال کیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ کے متعلق کچھ اپنے نظریئے قلمبند کردوں، گو میرے نظریات ارباب علم ونظر کے لئے کوئی وقیع حیثیت کے مالک نہ ہوں گے۔ مگر مجھے تفصیل سے کہنے کے لئے ایک کسوٹی پہ افسانے پرکھنے میں آسانی ہوگی۔

دنیا کی ساری رونق جذبات کی بدولت ہے اور یہ جذبات داخلی وخارجی ہوتے ہیں۔ داخلی وہ جو ہمارے دل ودماغ پر یکساں اثر کریں اور قوت ناطقہ کے ذریعہ لکھنے نیز پڑھنے والے کے دل ودماغ پر ایک ہی تاثر کے حامل ہوں۔ خارجی وہ کہ جن سے انسان وقتی طور پر مسرور ومحظوظ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اثر عارضی اور غیر مستقل ہوگا۔

نثر میں داخلی اور دیرپا جذبات کے اظہار کا سب سے موثر ذریعہ قصہ گوئی ہے حکمت اور فلسفہ کی خشک گتھیاں انسان پر گراں گذرتی ہیں۔ لیکن ان ہی حکمت آمیز باتوں کو قصہ یا کہانی کا لباس پہنا کر ادا کیا جائے تو انہیں زیادہ لطف لے کر پڑھا جاتا ہے۔ افسانہ کی بنیاد بھی اسی قسم کے قصہ یا کہانی کے سہارے پر رکھی جاتی رہی ہے

کسی غیر ملکی ادیب نے ایک مرتبہ افسانہ کے متعلق یوں اظہار خیال کیا تھا کہ "افسانہ ایک نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں آدھے گھنٹے سے دو گھنٹے تک کا وقت لگے"

افسانہ کی ابتدا ابتدائے عالم سے ہے ہر قوم سے کچھ نہ کچھ داستانیں اور روایات وابستہ رہی ہیں، رامائن اور مہابھارت اپنے عہد کی ہندوانہ داستانیں، بہادری کے قصے اور سماج کے حالات پیش کرتی ہیں۔ مگر ان داستانوں میں صداقت کا عنصر ہونے کے باوجود سچائی کا ستھراؤ مفقود نظر آتا ہے اس لئے بھی کہ یہ اس دور کی کہانیاں ہیں جبکہ آفتاب علم و تہذیب افق عالم پر ایک جھلکی بھی نہ ڈال سکا تھا، قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصے کہانیاں شائستہ ہو کر نکھر کر افسانہ بنتی گئیں۔

ناول کا اساس بھی داستان گوئی پر قائم ہے بلکہ یوں سمجھا جائے کہ افسانہ نے (فنی اعتبار سے مشرق و مغرب کے فرق کے باوجود) ناول سے ہی زرٹ لیا جو وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہا ہے۔ دراصل افسانہ نگار کے لئے میدان ہی بہت تنگ ہوتا ہے۔ اس کو مشاہدہ کے عمق تک گہری نظروں سے جانا ہوتا ہے۔ مقصد کی وسعت کو دریا در کوزہ کے مصداق محدود و قلیل طور پر تحریر کرنا پڑتا ہے

افسانہ میں کردار نگاری کی نفسیاتی مہارت کے ہوتے ہوئے بھی بعض وقت جذبات نگاری کا موقع کم ہی ملتا ہے اگر کوئی جذبات نگاری میں اعتدال کے ساتھ کامیاب ہو جائے تو یہ افسانہ نگار کی ہنر کاری ہے ورنہ افسانہ نگار کے قدم قدم پر رکاوٹیں بنتی ہیں اس کے پیروں میں طرح طرح کی بندشوں کی بیڑیاں ہوتی ہیں دراصل وہ اظہار مدعا

میں مقید انسان کی طرح ہوتا ہے افسانے میں ہر لمحہ پلاٹ پر نظر رکھنی پڑتی ہے اسلئے کہ اگر کوئی تحریک یا نکتہ بے ربط ہو گیا ہو تو افسانوی پہلو میں خامیاں ہونے لگتی ہیں۔

افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوا ہے کہ اس میں تین چیزیں لازمی ہیں۔ پلاٹ کردار اور رسم ورواج میں ماحول کا تاثر۔

ویسے تو زندگی بجائے خود ایک ایسا افسانہ ہے کہ جس میں سینکڑوں ضمنی افسانے روز پیدا ہوتے ہیں اور بھوک، قحط، ناکامی، مایوسی، غربت سب ہی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اوراق زندگی میں تلخ کامیاں زیادہ ہیں آسودگیاں کم۔ ان ہی حقیقتوں سے مل جلکر ایک اچھے افسانہ کی بنیاد پڑتی ہے یہاں افسانہ نگار کی قدرت کا صحیح اندازہ پلاٹ وواقعات کی روشنی میں اچھی طرح ہو جاتا ہے اس لئے کہ پلاٹ حاصل کرنا بھی جوئے شیر از کوہ بر آوردن کے کا مصداق ہے پلاٹ ہی پر افسانہ کی ترتیب کا دارومدار ہے۔ اتحادِ زبان۔ اتحادِ مکان اور اتحادِ اثر کے تحت پلاٹ کی تشکیل ہوتی ہے۔ پلاٹ کی تدریجی ترقی اور اس کو منتہا تک پہنچانے اور اس انتہا کو نبھانے میں افسانہ نگار کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے، اس دور میں ایسے افسانہ نگار بہت کم ہیں کہ جو ان کمالات کے حامل ہوں لے دے کے منٹو ممتاز شیریں، عسکری۔ اور بلونت سنگھ پر نظر جاتی ہے۔ مگر ممتاز شیریں اور عسکری تو اس کسوٹی پر ہر طرح پورے اترے ہیں اس کے بعد منٹو بلونت سنگھ اور دوسرے چند میں بھی یہ خصوصیات خال خال نظر آتی ہیں۔ یا مرحوم پریم چند کے چند افسانے بعض لغزشوں سے قطع نظر افسانہ نگاری کے اصولوں پر پورے اترے ہیں گو وہ اس ترقی یافتہ دور کے مثالی افسانے نہیں کہے جا سکتے۔

پلاٹ اور ترتیب کے ساتھ ساتھ کردار بھی افسانہ کا اہم جزو ہے۔ کردار کو افسانہ کی تحریک کہا جائے تو صحیح ہے افسانے میں کردار کی مقبولیت اس کے اعلیٰ پہناوے پہ ہے ایک انگریزی افسانہ نگار نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ "افسانہ کسی ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے" اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار و افسانہ لازم و ملزوم ہیں۔ کردار ایسا تخیلی ہونا چاہیئے جس کے حسن سیرت کی سب تعریف کریں۔ وقار عظیم لکھتے ہیں "کسی کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت لے کر اس کو مختلف حالتوں میں بیان کرنا افسانہ نگاری کا کامیاب اصول ہے"

ان دونوں مندرجہ بالا رایوں کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے تو کرشن چندر، تسنیم سلیم چھتاری، راجندر سنگھ بیدی کے چند افسانوں کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ناز کے افسانے "اور وہ سوچتا رہا" "اور جنوں بڑھتا گیا" کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ "اور وہ سوچتا رہا" میں رینو اور کرمانی کے کردار نہ صرف اہم ہیں بلکہ افسانے میں نمایاں ہیں اس پر اچھے پلاٹ کی تخلیق نے رینو کے کردار کو اتنا اہم کر دیا ہے کہ افسانے میں اگر یہ کردار نہ ہوتا تو شاید ایسا افسانہ ہی نہ بن سکتا ــــــ اسی طرح "اور جنوں بڑھتا گیا" میں اجمل اور نصرت کے کردار اجاگر ہیں پھر اس افسانے کا پلاٹ اتنا انوکھا ہے کہ جتنا پڑھتے جائیے اتنا ہی اس افسانہ کے انجام میں الجھتے جائیں گے مگر اجمل کے یکا یک تغیر اور ایک ہلکی سی کروٹ سے افسانہ کا پورا ماحول اتنا تبدیل اور بلند ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والا اس نتیجہ پر نہ صرف حیران ہو جاتا ہے۔ بلکہ افسانہ نگار کی شگوفہ کاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔

گذشتہ چند برسوں میں ادب کی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں ہو گئی ہیں

نئے تقاضوں اور نئے رجحانات نے افسانوی ادب میں چونکا دینے والا انقلاب پیدا کر دیا ہے اس بڑھتے ہوئے انقلاب کا اثر پریم چند کے آخری زمانے کے افسانوں میں بھی نظر آتا ہے قاضی عبدالغفار نے "لیلےٰ کے خطوط" کے ذریعہ افسانہ نگاری کو نئے راستے سے آشنا کیا۔ انگارے کے مصنف احمد علی "ہماری گلی" جیسا افسانہ لکھ کر افسانہ نگاری کا کچھ رخ بدلا، سجاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات" کے ذریعہ ناول اور افسانہ کی دنیا میں ایک عجیب کیف آور صور پھونکا، موجودہ دور میں افسانہ نگاری کے فنی تذکرہ میں اوپندر ناتھ اشک اور کرشن چندر کا نام چھوڑنا بھی غلطی ہوگی۔ راجندر ناتھ بیدی کے افسانوی مجموعہ "دانہ و دوام" اور حسینی کے افسانے "ایک ماں کے دو بچے" کا ذکر بھی اس ضمن میں کیا جا سکتا ہے کوئی "آرٹ" اگر فن کا کتنا ہی بہتر نمونہ کیوں نہ ہو اس میں اگر شگفتگی نہیں ہے تو وہ "آرٹ" مردہ ہے فن کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور جستگی کا تاثر بھی ہونا ضروری ہے، مجھے یہ خوبی نازؔ کے افسانے "اور دور چلتا رہا" میں نمایاں نظر آتی ہے نازؔ کا یہ افسانہ صرف شگفتگی کا حامل ہے بلکہ ہلکے ہلکے طنز اور میٹھے میٹھے درد کا بھی پتہ دیتا ہے۔ آفندی کا کردار اور اس کا شغل نوشا نوشش نیز اس کے وجود اتنے اہم ہیں کہ اس کے افسانے کو اکثر زندگیوں کی صادق داستان کہا جا سکتا ہے۔ نازؔ نے افسانے کا اختتام کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ دماغ میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ آفندی کے گلاس پر گلاس چڑھانے کا منظر ایلیسا سے نفرت کے باوجود اس کی طرف بڑھنے کا مظاہرہ اور پھر اچانک افسانہ کا اس طرح اختتام ——

"بینڈ بجتا رہا۔ فضا مسکراتی رہی۔ اور دور چلتا رہا" کہانی سے متعلقہ کرداروں کی زندگی اور خصوصیت کے ساتھ آفندی کے کردار کو پورے طور سے اس کے اسباب وعلل کے ساتھ ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ آفندی مجبور تھا اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے، سماج اور محبت کے مفہوم ومنشاء کو نہ سمجھنے والی ہستیوں کو ہم برا بھلا کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ کہانی سچی ہے ایسا ہوتا ہے اور اکثر ہوتا ہے۔

ماحول اور واقعات کی عکاسی طنز ولطافت کے رنگ میں دکھ درد کی کہانی کے لئے انوکھا طرز بیان ہمارے افسانہ نگاروں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے "سدرشن" کے چند افسانوں میں یہ خوبیاں ملتی ہیں شفیق الرحمٰن البتہ اس رنگ میں نہ صرف کامیاب نظر آتے ہیں بلکہ منفرد بھی ہیں۔ ان کا طنز لطیف ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا تلخ اور کتنا انوکھا ہوتا ہے اس کا اندازہ ان کے افسانے پڑھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ خوبیاں تمام وکمال ڈاکٹر تابانؔ کے سرد شعلے میں بھی نظر آتی ہیں۔ مگر ذرا انوکھے پن کے ساتھ۔ "مریضہ کے لئے ڈاکٹر کا آنا۔ مریضہ کا ہوش میں آنا اور علاج کے درمیان میں ہی اپنے شوہر سے نفرت کرنا، ڈاکٹر کی طرف ملتفت ہو جانا" مگر یہ التفات آسودگی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اپنی مردہ محبت میں زندگی کی جھلک پیدا کرنے کے لئے، پھر یکا یک مریضہ کا اس احساس سے پریشان ہو کر کہ کہیں محبت کے لطیف شعلے سرد نہ پڑ جائیں اس کا ڈاکٹر سے گریز کرنا اور اپنے جذبات کے خلاف ڈاکٹر کو بددل کرنے کے لئے پھر شوہر کی طرف جبراً ملتفت ہو جانا کتنا پاکیزہ

جذبہ ہے۔ محبت کے شعلوں میں جلنے کو معراج سمجھنا اور اس کو آلودہ نہ ہونے دینا کتنے بڑے کردار کا پتہ دیتا ہے، یہ سب کچھ انداز بیان کی خوبی ہے اور سوچنے کا ایک انوکھا طریق۔ ایسے افسانے بہت ہی عظیم تاثر کے حامل ہوتے ہیں ہمارے یہاں جن کی کمی ہے سرد شعلے اس دور کے افسانوں میں اپنی ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی میری نظر نازؔ کے افسانے "پرچھائیاں" پر پڑتی ہے افسانہ جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں، ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے کہ یہ داستانیں اپنی ہی تو ہیں اپنا ماحول ہے اپنے کردار ہیں ان میں سب کچھ اپنا ہے ماحول کا سمجھنا اور پھر اس کو اپنی تمام و کمال خوبیوں کے ساتھ قلمبند کرنا آسان کام نہیں، ممتاز شیریں کے متعدد افسانوں کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ شہاب کے ایک دو افسانے ضرور ہمارے ماحول اور ہماری سوسائٹی کے آئینہ دار ہیں۔

"پرچھائیاں" بھی ایک سچی اور انوکھی کہانی ہے۔ افسانہ پڑھتے پڑھتے ذہن و دماغ سے گذر کر آنکھوں کے راستے چند جیتی جاگتی چلتی پھرتی "پرچھائیاں" ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ دوشیزہ عصمتوں اور ستائی ہوائی جوانیوں کی سسکیاں ہمارے کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جابر اور عیاش سماج کے اجارہ داروں کا گھناؤنا کردار روز روشن کی طرح ہمیں نظر آنے لگتا ہے اور پھر اس پر نازؔ کی طنزیہ تحریر کے زہریلے نشتر جگر کے پار ہو جاتے ہیں اور دماغ کو یہ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے ہمیں اس فرضی اور جابر سماج کے گاڑے ہوئے جھنڈوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔

ڈاکٹر ناز کے افسانوں کا ماحول صاف ستھرا اور سجا ہوتا ہے۔ قرۃ العین کے افسانوں کے ماحول کی طرح الجھا ہوا، محمل اور نیم مغرب زدہ نہیں ہوتا۔ ان کے افسانوں میں کرشن چندر کے طنز کا پھیکا پن بھی نہیں ہے۔

تفصیل سے ایک ایک افسانے پر لکھنے کے لئے وقت اور صفحات درکار ہیں ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت ممکن نہیں ورنہ اس مجموعہ کے اور بھی کئی افسانے ایسے تھے کہ جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا جن افسانوں پر میں نے اظہار خیال کیا ہے وہ بھی اتنا تفصیلی نہیں کہ جس سے میں خود بھی مطمئن ہو جاؤں۔ میں نے تو افسانے کو اپنی نظر سے دیکھا اور پڑھا اور اس کے بعد اپنے تاثرات کے صرف اشارے آپ کے سامنے رکھدیئے، یہ ضرور ہے کہ ناز کے افسانوں پر یہ ہلکا سا ریویو سنگ میل نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر مجھے اپنی رائے پر اتنا یقین ضرور ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو اس کتاب کے پڑھنے والے غلط یا ناجائز قصیدہ گوئی نہیں کہہ سکتے۔ میں کبھی کسی کتاب کے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہوتا جب تک کہ میں یہ فیصلہ نہ کر لوں کہ افسانہ نگار اور افسانوں کا تاثر میرے فکر و خیال پر ہے یا نہیں، میں یہ لکھنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا کہ ناز کے چند افسانوں نے مجھ پر خاطر خواہ اثر کیا ہے۔ میں ان افسانوں کو اس دور کے اچھے اور معیاری افسانوں میں سمجھتا ہوں ناز کے افسانوں کے سمجھنے اور مجھ پر اثر انداز ہونے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مجھ سے قریب ہیں بلکہ میرے اپنے ہیں۔ میں نے ان کے افسانوں پر لکھنے سے پہلے ان کی زندگی پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے

نازؔ کا نام ممکن ہے رسائل واخبارات کی دنیا میں نیا ہو چونکہ وہ چھپنے چھپانے سے بے نیاز ہی رہے ہیں۔ مگر ان کا افسانوی ذوق کافی پرانا ہے وہ عرصہ تک نہ صرف افسانے لکھتے رہے بلکہ نفسیات کے گہرے مطالعہ میں سالہا سال تک غرق رہے انکی کتاب "ازدواجی الجھنیں" بھی منظر عام پر آچکی ہے اس نفسیاتی کتاب کو دیکھنے کے بعد میں نے نازؔ سے پوچھا کہ تم نے پہلے افسانوں کا مجموعہ کیوں نہ ترتیب دیا؟ نازؔ نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے یہ جواب دیا۔

"انصاری! ہمارے یہاں افسانہ نگار کو کوئی حیثیت حاصل نہیں وہ درجنوں اچھے افسانے لکھنے پر بھی پبلشرز کی کرم نوازی کی بدولت آسودہ حال نہیں ہوتا۔ اسلئے میں نے اپنی تحریر کا موضوع نفسیات کو بنانا بہتر سمجھا"

ڈاکٹر نازؔ ایک سرمایہ دار گھرانے کے ممتاز رکن ہیں۔ بڑے بڑے کاروبار کرتے ہیں کاروباری اداروں میں بڑی بات رکھتے ہیں۔ مگر ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان میں حیران کن خصوصیت یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار ہونے کے باوجود سرمایہ دارانہ ذہنیت نہیں رکھتے، غریبوں کے دکھ درد کے ساتھی ہیں اپنے سے کم درجے کے لوگوں اور مزدوروں سے بالکل مساویانہ انداز میں رابطہ رکھتے ہیں ان کے یہاں درجنوں ملازم ہیں اور وہ سب ملازم ان سے خوش ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی سرمایہ دار کے جابرانہ طرز عمل پر شکوہ سنج نظر نہیں آتا۔ نازؔ نے غم خوردہ ہستیوں کی کہانیاں سنی ہیں۔ ان پر افسانوں کی بنیاد رکھی ہے۔ انھوں نے مزدوروں۔ کے گلہ شکوے دوسرے سرمایہ داروں سے متعلق بگوش ہوش سنے اور پرکھے ہیں سرمایہ داروں کی دھجیاں بھی اڑائی ہیں انکی

جابرانہ ذہنیت پر طنز بھی کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں خلوص اور غیر جانبداری کے جوہر نمایاں ہیں، کمیونزم زدہ اور نام نہاد نوزائیدہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح فرضی قصّے تصنیف نہیں کئے کہ جنہیں نہ سرمایہ دار کے قریب جانے کی ہمت کبھی ہوئی اور نہ ہی مزدوروں، غریبوں، بیکسوں کی داستانِ غم و الم سننے کی توفیق۔

ان کے افسانوں کی بنیاد ہمیشہ کسی صحیح واقعہ کے تاثر پر رکھی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے اپیل کرتے ہیں، ان میں وہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں کہ جنپر افسانہ کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں کہ جسے کمزور یا کھوکھلا کہا جا سکے۔

میں اس مجموعہ کی اشاعت پر مسرور ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ناز کے افسانے ارباب علم و نظر سے خراج تحسین حاصل کریں گے قبولیت عامہ کی دعا کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔

"یار زندہ صحبت باقی"

خاکپائے ادب

رتن تلاؤ۔ کراچی　　　　اختر انصاری (اکبر آبادی)

۲۸ اکتوبر سنہ ۴۹ء

پرچھائیاں

(احباب متعلقہ سے معذرت کے ساتھ)

مقام :- آپ کا شہر اور ایک خوبصورت کوٹھی۔

وقت :- شام کے سات بجے۔

فضا :- ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے، ہوا تیز ہے۔ وقت سے پہلے اندھیرا چھا گیا ہے موسم خوشگوار ہے۔

اہم کردار :- ایک نوجوان مرد اور ایک جوان عورت۔

سائڈ کردار :- دو سپاہی۔

پردے ہوا سے لہرا رہے ہیں کھڑکیاں کھڑکھڑا رہی ہیں۔

ایک خوبصورت کمرہ ہے، صوفے پر نوجوان بیٹھا ہے اس کے سامنے ایک جوان عورت جس کے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے ہیں، بال بکھرے ہوئے ہیں چہرے سے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ بہہ رہے ہیں، بڑھاپے سے بہت پہلے چہرے پر مردنی چھا گئی ہے، آنکھیں بے رونق وحشت زدہ ہیں۔ لبوں پر مسکراہٹ طعنہ بنکر جمی ہوئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے دل میں کوئی بہت ہی خوفناک تصور کروٹیں بدل رہا ہے

عورت :- (خوفزدہ لہجہ میں) تم نے دیکھی ہیں یہ ——— یہ خوفناک پرچھائیاں... یہ جو تمہارے چاروں طرف......

نوجوان:۔(چونک کر) کون سی پرچھائیاں۔ کہاں کدھر!"

عورت (باہر کی طرف جھانکتے ہوئے) تم نہیں دیکھ سکتے؟ . . . . تم مرد ہو! تمہارے اندر تمہارے سینے میں پتھر ہے اور تمہارے ان گنجان بالوں بھرے سر میں، ہاں اس بڑے اور چپٹے سر میں اتنی دور تک سوچنے والا دماغ نہیں۔ اور تمہاری ان جھریوں جیسی آنکھوں میں اتنی لباط کہاں کہ تم یہ پرچھائیاں دیکھ سکو. تم نہیں دیکھ سکتے. تم نہیں دیکھو گے. تم مرد ہو خونخوار مرد!"

نوجوان۔ (گھبرا کر) مگر . . . .

عورت:۔ (اسی لہجے میں) مگر تمہیں انسان ہونے کا فخر حاصل ہے، اپنے مرد ہونے کا تکبر ہے. تم نے قوم کی تعمیر کے دعوے کئے. تم نے ـــــ ہاں تم نے انسانیت کے جسم پر چڑھے ہوئے شیطانی لبادے کو پھاڑ پھینکنے کا خواب دیکھا۔ اور تم کو یہ پرچھائیاں نظر نہیں آتیں. یہ خوفناک پرچھائیاں جیسے کسی نوجوان بیوہ کا خواب ـــــ وہ ـــــ وہ دیکھو کتنی خوفناک ہیں یہ اور تم کہتے ہو کہ دکھائی ہی نہیں دیتیں کیسے انسان ہو تم بھی.

نوجوان (پہلو بدل کر) اوہ! کچھ سوگی بھی تم"

عورت۔ ہاں۔ سناؤ۔ تم ہمیشہ سناتے آئے ہو تم نے سنانے اور نہ سننے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے کہ زمانے میں تمہیں اقتدار حاصل ہے اس لئے تم قوم کے لیڈر ہو اسلئے کہ تم شاعر ہو، ادیب ہو آرٹسٹ ہو، سیاستداں ہو تم سب کچھ ہو، تہذیب اور تمدن کے علمبردار مذہب اور قوم کے راہبر تم سناؤ۔ مگر تم سنانا نہیں چاہتے تم حکم دینا چاہتے ہو حکم جو تمہاری گھٹی میں پڑ چکا ہے۔ حکم جو تمہیں تمہارے باپ سے اور تمہارے باپ

کو تمہارے دادا سے ورثہ میں ملا ہے۔ تم سناؤ میں سنوں گی مگر یہ خوفناک پرچھائیاں تمہیں نظر نہیں آئیں گی یہ ڈراونی اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نوجوان :۔(تلملا کر) خدا کے لئے چپ رہو تم تو بہک گئی ہو، بارش کتنی تیزی سے ہو رہی ہے اور ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔۔۔"

عورت :۔ ہاں بارش تیزی سے ہو رہی ہے اور ہوا سیٹیاں بھر رہی ہے کہدو کہ ہوا سیٹیاں بھر رہی ہے، کتنے ناداں ہو تم۔ کتنے جاہل۔ تم نہیں جانتے کہ یہ ہوا کی سیٹیاں نہیں، یہ ان پرچھائیوں کی چیخیں ہیں خوفناک چیخیں۔

ہاں ذرا غور سے سنو! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عصمت باختہ دوشیزہ کی روح چلا رہی ہے، تم کو سنائی نہیں دیں گی یہ دم توڑتی ہوئی عصمتوں کی سسکیاں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ تمہاری ان بہنوں کی آوازیں ہیں جن کو تم چھوڑ کر بھاگ آئے ہو! جن کو تم نے تمام عمر اپنے سائے میں رکھنے کا عہد کیا تھا، جن کا ایک بال تک ننگا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی تم نے یہ ان ہی بہنوں اور ماؤں کی پکار ہے۔ ۔ ۔ یہ ان۔ ۔ ۔"

نوجوان :۔ او میرے خدا کیا مصیبت مول لے لی ہے۔

عورت :۔ ہاں مصیبت! عورت مرد کے کندھوں پر ازل سے مصیبت بنی رہی ہے، بہت بڑی مصیبت مگر مرد پھر بھی اس مصیبت کو اپنے اعصاب پر سوار کئے آج تک گھومتا رہا اور گھومتا رہے گا، اور یہ پرچھائیاں منہ پھاڑے اس کے سر پر منڈلاتی رہیں گی۔

نوجوان :۔ لاحول ولاقوۃ۔ تو پھر اس میں مرد کا کیا قصور؟

عورت :- اتنے عرصہ میں صرف ایک بات عقلمندی کی کی ہے تم نے اس میں مرد کا کیا قصور۔ ہاں مرد کا کوئی قصور نہیں اس کا کوئی جرم نہیں. عورت کے عصمت کے تاروں کو مرد نے اپنے ہوس کے دانتوں سے نوچا۔ اس میں مرد کا کیا قصور۔ عورت کا لباس پھاڑ کر اس کو بالوں سے پکڑ کر سڑکوں پہ ننگا گھسیٹا اس میں مرد کا کیا قصور، عورت کی کوکھ سے چھ چھ ماہ کے بچے اپنی تلواروں اور بھالوں سے باہر نکال پھینکے اس میں مرد کا کیا قصور۔ یہ تو سراسر عورت کا قصور تھا جس نے تمہاری حکومت کو برداشت کیا، جس کو تم نے مذہب اور تہذیب کا واسطہ دیکر گھر کی چار دیواری میں بند رکھا جس نے خود کو اتنا نحیف اور نازک بنایا کہ وہ اپنی حفاظت تک نہ کر سکی، وہ سونے اور چاندی کی ہتھکڑیاں پہن کر خوش ہوتی رہی۔ اور تم مردوں نے اس کو یقین دلایا کہ مدافعت کا تمام ذمہ تمہارے سر پر رہے گا، عورت گھروں میں بیٹھ کر بچے پیدا کرتی رہی، اس میں عورت ہی کا قصور تھا، تم نے اس کو کہا کہ پردہ کرو! میں جانتی ہوں تمہارے لاشعور میں کیا تھا، تم خود عیاش تھے دوسروں کی عورتوں کو جھانکتے تھے اس لئے تم اپنی عورتوں کو پردا کراتے رہے تاکہ کوئی دوسرا تمہاری ان عورتوں کو نہ جھانک سکے تم تمام دنیا کو اپنا جیسا سمجھتے تھے اس میں بھی عورت کا قصور تھا۔

نوجوان :- آخر تم پچھلی باتیں کیوں دہرا رہی ہو، ان کو بھول جانا چاہیئے۔

عورت :- (طنزیہ مسکرا کر) بھول جانا چاہیئے ہاں بھول ہی جانا چاہیئے، عورت نے ایک دانہ گندم مرد کو دیا تھا اور مرد آج تک اس کو طعنہ بن کر چمٹا رہا۔ مگر مرد نے عورت کے تمام حقوق چھین لئے، اس لئے عورت کو بھول جانا چاہیئے مگر کیا یہ خوفناک پرچھائیاں جو

راتوں کو تمہارے خوابوں میں اگر چونکا دیتی ہیں تمہیں بھول جانے دیں گی۔ یہ خوفناک چیخیں تمہارے لاشعور سے تمہاری ماؤں اور بہنوں کی پکار کو بھول جانے دیں گی۔ تم کہو گے یہ پرانا قصہ ہے دل کے زخم ہرے نہیں کرنے چاہئیں، درست کہا تم نے مگر تمہارے دل پر زخم ہی کب لگے تھے، تمہارے سینے میں دل ہی کب تھا۔ اور آج کہتے ہو کہ تمہیں یہ خوفناک پرچھائیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ تمہاری ماؤں اور بہنوں کی پرچھائیاں جن کو تمہارے جیسے مردوں نے روند کر ان کی روح تک کو آلودہ کر دیا ہے اور آج وہ بچی کچی پرچھائیاں سرحد کے اس پار تمہیں پکار رہی ہیں۔ تم ان کا نام اخبارات میں پڑھتے ہو اور خاموش ہو جاتے ہو اس لئے کہ ان کو تمہارے جیسے درندوں نے آلودہ کر دیا ہے اس لئے کہ ان کی عصمت جس کے محافظ تم ہو تمہارے سامنے نوچ ڈالی گئی، اس لئے کہ ان کی کوکھ میں تمہارے دشمنوں کے ڈالے ہوئے "پلے" پل رہے ہیں اور تم —— تم بھول جانا چاہتے ہو۔ آج تمہاری غیرت تمہاری پردہ داری کس پردے میں چھپ کر رہ گئی ہے؟ وہ بہنیں وہ مائیں اور بیویاں جن کو تم نے پردے میں ڈال کر ان کی آواز تک کو قید کر رکھا تھا آج سرحد کے اُس پار تمہیں چیخ چیخ کر پکار رہی ہیں اور تم سوئے ہوئے ہو! —— تم —— تم مرد —— اُف —— کون جانے کہ ایک دفعہ تاریخ پھر خود کو نہیں دوہرائے گی، ایک دفعہ پھر وہی طوفان وہی خونخواری کا دور نہیں آئے گا۔ اور پھر ایک دفعہ یہ پرچھائیاں اِدھر اُدھر ماری ماری نہیں پھریں گی۔ تم بھول جانا چاہتے ہو تم . . . . . .

نوجوان۔ بارش ایسا معلوم ہوتا ہے شاید بند ہو گئی ہے۔

عورت :۔ ہاں بارش بند ہو گئی ہے اور تم مجھے بھگانا چاہتے ہو، تم نے مجھے بارش کے تھمنے تک پناہ دی تھی، میں راستہ بھول گئی تھی، تم نے کہا تھا اندر آجاؤ، بارش بہت تیز ہے، ہوا خنک تھی موسم خوشگوار تھا تم تنہا تھے ایسے میں اگر کوئی بھولی بھٹکی عورت آنکلے تو تمہیں اور کیا چاہیئے، تم نے مجھے اندر بلالیا تھا، تم نے مجھے کپڑے بدلنے کا حکم دیا تھا کہ تاکہ نیم عریاں عورت تمہارے سامنے بالکل ننگی ہو کر آبیٹھے۔ اور تم بارش تھمنے تک اس کی جوانی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لو، جس طرح بادلوں کا آخری قطرہ تک برس چکا ہے، مگر تم کو مایوسی ہوئی یہ بھولی بھٹکی عورت معصوم نہ تھی یہ بھولی بھٹکی عورت تم جیسے بیسیوں مردوں کے خلوت کدوں میں زبردستی داخل کی جا چکی تھی، اس کی جوانی کا ایک ایک قطرہ نچوڑا جا چکا تھا۔ اس عورت کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اس کے کپڑوں کا ایک ایک تار نوچا گیا۔ اور پھر تم جیسے درندوں نے اس بھولی بھٹکی عورت کے عصمت کے ساتھ خوب کھیل کھیلا۔ جی بھر کر کھیلا، میرے محلے کے اس نوجوان نے میری دوشیزگی کے پرخچے اڑائے جو مجھے کہا کرتا تھا۔

"دی دی میں تمہارا سگا بھائی ہوں"

کیا تم توقع کر سکتے تھے کہ اتنی تجربہ کار عیار عورت تمہیں اس حسین شام میں داد عیش دے سکے گی، اور اب جبکہ بارش بند ہو چکی ہے تم اکتا چکے ہو تم مجھے بھگانا چاہتے ہو

نوجوان :۔ تم نے غلط سمجھا میں نے تمہیں پناہ دی تھی۔

عورت :۔ ہاں پناہ دی تھی اس لئے جب میں دبے پاؤں کمرے میں آئی تو تم نے دوڑ کر الماری سے وسکی کی بوتل نکال لی تاکہ جام دو آتشہ ہو جائے۔

نوجوان:۔ (گرم ہوکر) تم بھول رہی ہو۔

عورت:۔ (اسی طرح سنجیدگی سے) ہاں میں بھول رہی ہوں۔ میں اپنا راستہ بھول گئی ہوں مگر اب ایسا لگتا ہے کہ یہ تمام دنیا اپنا راستہ بھول گئی ہے، یہ لوگ اپنی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور یوں ہی چلے جا رہے ہیں۔ بے مقصد بے منزل مسافر کی طرح۔ اور تم بھی راستہ بھول چکے ہو، تم بھی تھکے ہوئے مسافر کی طرح تھوڑی دیر سستانا چاہتے ہو تھوڑی دیر عیش کرنا چاہتے تھے جس طرح تمہارے بیسیوں مردوں نے میرے جسم کے ساتھ لپٹ کر سستایا ہے جس طرح انھوں نے میرے رونئیں رونئیں سے داد عیش چاہی تھی، میری روح تک کو جھنجھوڑ ڈالا تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جابر تھے اور تم بزدل ہو، وہ ظالم تھے اور تم عیار ہو اور ــــ اور جب تمہاری فوج کے سپاہیوں نے مجھے اور میرے جیسی دوسری عورتوں کو ان کے بند کمروں سے نکال کر ان کا نام و پتہ لکھا تو میں نے اپنا اپنے باپ بھائی۔ چچا ماموں سب کا پتہ لکھا دیا۔ وہ اخبارات میں چھپا ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوتا رہا مگر میرا باپ۔ بھائی چچا ماموں سب خاموش رہے اور آج ان کی وہ بچی اللہ کی وہ بہن راستہ بھول کر تمہارے کمرے میں آبیٹھی ہے اور تم مجھے بھگانا چاہتے ہو آؤ ــــ آؤ وقت کم ہے شراب تیز ہے۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

عورت:۔ (مسرت سے) وہ آگئے۔

نوجوان:۔ (حیرانی سے) کون ــ کون آگئے۔

عورت:۔ مجھے راستہ بتانے والے، مجھے میرے گھر لے جانے والے یہ تم سے بہتر ہیں جو مجھے میرے اپنے گھر لے جائیں گے جہاں میرے جیسے سینکڑوں مرد اور عورتیں رہتی ہیں، جہاں بھکے بھکے انسان بستے ہیں۔

وہ تم اور تمہاری قوم کی طرح دھوکہ باز نہیں، وہ معصوم ہیں انوکھے ہیں۔ تم سب سے بے نیاز ان کی اپنی دنیا ہے، جہاں کوئی اپنے باپ اور بھائی کو نہیں جانتا۔

(دوبارہ دستک ہوتی ہے)

وہ بالکل حقیقی زندگی گذار رہے ہیں وہ ننگے رہتے ہیں تو ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔ ان کے دل پاک ہیں۔ جاؤ دروازہ کھول دو میں جانا چاہتی ہوں۔

(نوجوان دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

نوجوان:۔ کون ہے۔

آواز:۔ ہم ہیں — پاگل خانے کے محافظ — کچھ دیر ہوتی ہے ایک عورت بھاگ کر اِدھر آئی تھی معلوم ہوا ہے کہ وہ آپ کے کمرے میں ہے"

نوجوان:۔ پاگل! — مگر یہاں تو کوئی نہیں۔

(عورت اسکی پشت پر آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

عورت:۔ ہاں میں پاگل ہوں، یہ دنیا والے ہوشمند انسان کو پاگل ہی کہتے ہیں جب کوئی انسان ان کی دنیا کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے تو یہ اس کو پاگل ہی کہتے ہیں۔ تم خود پاگل ہو اس لئے مجھے پہچان نہ سکے، تمہارا دماغ مفلوج ہو چکا ہے

سپاہی:۔ یہی ہے وہ صاحب۔

نوجوان:۔ نہیں نہیں یہ پاگل نہیں یہ تو . . . . "

عورت:۔ میں پاگل نہیں، یہ تمام قوم پاگل ہے: اس لئے میں نے اپنے لئے الگ جگہ تلاش کر لی ہے اس تمام دنیا سے دور ان تمام پاگلوں سے دور ایک علیحدہ دنیا، جہاں میرے جسم اور روح کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں۔ اب مجھے میرے باپ بھائی کی ضرورت نہیں۔ وہ پاگل ہیں اور میں پاگلوں کے ساتھ ایک لمحہ گذارنے کے لئے تیار نہیں۔

سپاہی:۔ (بڑھکر) چلو چلو بڑی باتیں بنالیں۔

عورت (جاتے ہوئے) خدا حافظ نوجوان مرد! تمہارا شکریہ تم نے چند لمحوں کے لئے ایک بھٹکی ہوئی پرچھائیں کو پناہ دی۔

نوجوان (حواس باختہ ہو کر) ٹھہرو — یہ پاگل نہیں — اسے مت لیجاؤ۔ مت لے جاؤ — یہ میری بہن ہے۔ اسے مت لے جاؤ — مت لے جاؤ۔

(اس کی آواز ہوا کی سیٹیوں میں مدغم ہو جاتی ہے اور بجلی دور سے کڑکڑاتی ہے

ردِّعمل

"یہ رومال کس نے بنایا ہے" راشد نے جاوید کی جیب سے رومال نکال کر کہا۔

"میری بیوی نے" جاوید نے فخریہ سر بلند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوبصورت رومال ہے" رشیدہ نے بھی تعریف کی۔

"وہ خود بھی تو خوبصورت ہے" جاوید نے بیوی کی تعریف کی۔

"تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے، جاوید" رشیدہ نے پوچھا۔

"لانا تو چاہا۔ مگر بہت مصروف تھی، اس لئے نہیں لا سکا"

"بہت مرعوب معلوم ہوتے ہو جاوید" پاس بیٹھے ہوئے امجد نے چھیڑا۔

"تمہاری بیوی بدصورت ہوگی امجد" جاوید نے نشتر مارا۔ اور امجد نے راشد کی جانب حمایت کی خاطر دیکھا۔

"اس لئے آدھا سر فارغ البال نظر آرہا ہے" رشیدہ نے جاوید کی جانب سے جواب دیا، اس کا بھائی راشد بوکھلا گیا۔ اور جاوید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کر دیا۔ امجد کا ہاتھ غیر شعوری طور پر اپنے سر کی جانب اٹھ گیا، کمرہ میں ایک طویل قہقہہ بلند ہوا۔ اور پھر سکوت طاری ہوگیا۔

"سنا ہے کہ امجد صاحب کے سسر بزرگوار باٹا شو کمپنی کے مینجر ہیں" جاوید نے

رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

"اور تمہاری بیگم کو اکثر ربڑ سول کی جوتیاں پارسل کیا کرتے ہیں" امجد نے سٹپٹا کر کہا۔

"ارے توبہ! آپے سے کیوں باہر ہوئے جاتے ہو تم سب" رشیدہ نے فضا کو مکدر دیکھ کر کہا۔

"آخر ہوا کیا بات تو صرف جوتیوں کی ہی ہے" راشد نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں جوتیاں پارسل ہوتے ہوتے یہاں پر ہی ان پیک UN PACK نہ ہونے لگیں، قصہ صرف اتنا تھا کہ جاوید کا رومال بہت خوبصورت ہے" رشیدہ بولی۔

"اور میں نے رومال کے خالق کی اگر تعریف کر دی تو اس پر امجد صاحب کیوں چڑ گئے" جاوید نے کہا۔

"میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم اپنی بیگم سے بہت مرعوب ہو ہر جگہ اس کی تعریف اسی کا نام" امجد نے پھر چھیڑا۔

"میں سمجھتا تھا کہ تم ذراسی عقل کے مالک ضرور ہو گے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ تم بالکل بودے ہو جس کا ثبوت بھی تم نے پیش کر دیا" جاوید بولا۔

"ثبوت — یعنی کیا" راشد نے کریدا۔

"گویا وہ شخص جو کسی سے مرعوب ہوتا ہے ہر جگہ اس کی تعریف کیا کرتا ہے کم از کم مجھے امجد کا یہ فلسفہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا ہے"

"اور تم عورتوں کے معاملے میں بالکل خالی الذہن ہو۔" امجد نے پھر تیر پھینکا۔

"اور آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کے کردار اور افعال کو اپنے ذہن پر سوار کر رکھا ہے۔" رشید نے مسکرا کر امجد سے کہا۔

"کم از کم مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور بری طرح چاہتی ہے۔" امجد نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ذرا آنکھیں گھما کر کہا، اتنا سنتے ہی جاوید نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"یعنی اس ہنہنانے کا کیا مطلب۔" امجد نے چڑ کر پوچھا۔

"اب تک تم اس بات کے منتظر تھے کہ تمہیں بھی اپنی بیوی کے معاشقے کا ذکر کرنے کا موقع ملے اور رشید نے یہ موقع تمہیں دیدیا۔" جاوید نے کہا اور امجد ایسا بہکا کہ اٹھ کر بھاگ نکلا۔

"تم نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھدیا جاوید۔" رشید نے کہا۔

"اب بیچارہ بیوی کی گود میں جا کر دم لے گا۔" راشد نے مڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ بیوی کی گود میں سر رکھ کر روئے گا۔" جاوید بولا۔

"روئے گا؟" رشید نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں روئے گا! جو لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیوی کے دل پر بلا تحریر درجسٹری مکمل قبضہ کر رکھا ہے وہ عموماً غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور جب ان کی اس خوش فہمی کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ رو دیا کرتے ہیں اور وہ بھی بیوی کی گود میں سر رکھ کر۔" جاوید نے اپنا فلسفہ چھیڑا۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو سمجھ لیا ہوگا" رشیدہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بیوی کو سمجھ لینا میرے نزدیک دنیا میں جنت بنا لینا کے مترادف ہے۔"

"عورت اتنی الجھی ہوئی تو نہیں ہے، جاوید" رشیدہ نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔ وہ بھول گئی کہ اس کا بھائی ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔

"نہیں رشیدہ! عورت ایک ایسا الجھا ہوا افسانہ ہے جس کے بہت سے باب ہیں ۔۔۔ پڑھتے چلے جاؤ۔ مگر جب پڑھتے پڑھتے یہ سوچنے لگو کہ تم نے کیا پڑھا ہے تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے" جاوید نے نفسیات کی کتاب کا آغاز کیا۔

"گویا تم، تاحال اپنی بیوی کو نہیں سمجھے" راشد نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہاں پر کوئی شوہر اپنی بیوی کو نہیں سمجھا اور کوئی بیوی اپنے شوہر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی، ہمارے سماج نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا دشمن قرار دے دیا ہے ــــــ جہاں تک میرا خیال ہے میری بیوی مجھے چاہتی ہے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میری منتظر ہوگی، ایسے ہی جیسے کوئی راہ گیر لاشعوری طور پر کسی حادثے کا منتظر ہو، اُف یہ لاشعوری انتظار! ــــــ میں اس وقت اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہوں جب وہ مجسمہ لاشعور بنی بیٹھی ہو، مگر جب بھی وہ شعور میں آتی ہے فوراً بیوی سے عورت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اس وقت میرے تخیلات کے ناخن اس بیوی اور عورت کے بنے ہوئے جال کو چیرنے کے لئے خلا میں حرکت کرنے لگتے ہیں مگر ناکام!" جاوید نے کہا اور رشیدہ کی جانب دیکھتا رہا۔ رشیدہ کو محسوس

ہوا کہ وہ اس وقت اس میں اور اپنی بیوی میں اسی حد فاصل کو دیکھ رہا ہے جو ایک بیوی اور عورت کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"جاوید اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہاری بیوی کسی اور سے محبت کرتی ہے تو تم کیا کرو" راشدہ نے پھر چھیڑا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئیے" جاوید نے جواب مانگا۔

"خودکشی" راشدہ بولا

خودکشی ایک بزدلانہ فعل ہے۔ زندگی سے فرار حاصل کرنا آسان ہے۔ مگر زندگی میں گتھ جانا دشوار ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کبھی آسان راہ اختیار نہیں کی"

"تو پھر کیا کرو" رشیدہ نے کریدا۔

"وہی جو ایک ہوشمند انسان کو کرنا چاہئیے ——"

ہر انسان کو خواہ وہ عورت ہو یا مرد اپنے زندگی کے لئے حسین ساتھی چننے کا حق حاصل ہے۔ اگر میری بیوی نفسیاتی طور پر مجھ سے ناخوش ہے تو مجھے خندہ پیشانی سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئیے زندگی ہر بار اپنے لئے ایک نئی راہ نکال لیتی ہے۔

رشیدہ! یہ زندگی نئی راہوں سے پٹی پڑی ہے"، جاوید نے مسکرا کر کہا، رشیدہ کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں، اور کچھ دیر بعد رشید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلدیئے" رشیدہ نے پیار سے پوچھا۔

"ہاں" جاوید نے کہا اور چلا گیا۔

"اونہ۔ فرائیڈ کا بچہ" راشد نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"چپ رہو جی، بیٹھ پیچھے گالیاں دینے سے فائدہ" رشیدہ نے غصہ سے کہا۔ اور اس کا بھائی بوکھلا گیا۔

جاوید گھر پہنچا تو اس کی بیگم حسب معمول منتظر تھی۔

"بہت دیر کر دی آپ نے" حمیدہ نے بےچینی کا اظہار کیا۔

"بس یونہی دیر ہو گئی باتوں میں"

"کیا باتیں ہو رہی تھیں" حمیدہ نے پوچھا۔

"تمہارا ہی ذکر تھا"

"اے چھوڑو بھی۔ مجھے بھلا کیوں یاد کرنے لگے" وہ اترائی۔

"سچ کہتا ہوں —— آج تمہاری وجہ سے جھگڑا مول لے لیا میں نے" جاوید نے اپنی ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے کہا۔

"حمیدہ"

"جی"

"میں اکثر سوچتا ہوں کہ واقعی تم مجھے اتنا ہی پسند کرتی ہو جتنا میں سمجھتا ہوں" جاوید نے حمیدہ کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ آج آپ کو کیا سوجھی" حمیدہ نے شرما کر کہا۔

"آج دوستوں میں یہی بحث ہو رہی تھی"

"کون کون تھے"

"دو چار تھے اور امجد مجھ سے الجھ گیا تھا"

"امجد" حمیدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں! مگر آخر میں ایسا بھاگا کہ گرد تک کا پتہ نہیں —— ہاں تو تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا" جاوید نے بیقراری سے پوچھا۔

"گویا آج مجھے نئے سرے سے داستان محبت سنانی پڑے گی" حمیدہ نے پیار سے کہا اور خود کو جاوید کی گود میں گرا دیا، جاوید مطمئن ہو گیا وہ سوچنے لگا عورت کا محض آغوش میں گر جانا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مرد کو چاہتی ہے۔

"حمیدہ! فرض کرو کہ تمہاری شادی میرے بجائے کسی اور سے ہو جاتی تو کیا تم اس کو بھی اتنا ہی چاہتیں جتنا مجھے" جاوید نے دانستہ الجھاؤ پیدا کر دیا۔ لیکن حمیدہ خاموش تھی،

"جواب دو حمیدہ"

"سوچ رہی ہوں کیا جواب دوں"

"وہی جو سچ ہے"

"یہی تو مصیبت ہے اس سوال کا جواب کوئی پہلو ہی نہیں رکھتا نہ سچ اور نہ جھوٹ" حمیدہ نے خلا میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یعنی تمہیں اپنی محبت کی پختگی کا یقین نہیں"

"نہیں یہ بات نہیں —— اچھا آپ ہی اس کا جواب دیدیں" حمیدہ نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیوں" جاوید بولا۔

"کیوں نہیں، اگر آپ کی شادی میرے بجائے۔۔۔۔۔"

"واہ ہو بہت دور کی سوجھی ـــ بھئی واہ واہ داد دیتا ہوں" جاوید کے پاس سوائے داد دینے کے اور کچھ بھی نہیں تھا وہ سوچنے لگا۔

"ہماری محبت ایک مجبور ہوتی ہے" اس کو اپنا سوال آپ ہی برا لگنے لگا، رات بھر وہ ازدواج اور محبت کے مابین حدیں قائم کرتا رہا اور حمیدہ اس کے پہلو میں خراٹے لیتی رہی، دوسرے دن وہ نائٹ شفٹ پر تھا، دفتر میں کاغذ سیاہ کرتے کرتے اور ٹائپ رائٹر کی کھٹا کھٹ سنتے سنتے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا، وہ بار بار حمیدہ کا بنا ہوا رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اور ایک دم اس کی نظریں رومال پر جم کر رہ گئیں، اس کے اعصاب میں تشنج پیدا ہو گیا۔ چیونٹوں کی مسلسل قطار اس کی ریڑھ کی ہڈی سے نکل کر سر میں گھسنے لگی، وہ فائلوں سے اکتا گیا، رومال اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور اس کا دل سینے میں اچھل رہا تھا، ایسا کہ وہ خود بھی اس اچھلنے کا تجزیہ نہ کر سکا۔

اس نے چپراسی کو بلایا اور کچھ ہدایات دے کر اپنے گھر چل دیا، رات کا وقت تھا شدت کی گرمی تھی اس نے ٹائی کی گرہ کھولی، اور لمبی بل کھاتی ہوئی سلیٹی رنگ کی سڑک پر وہ تھکے ہوئے کیڑے کی طرح رینگنے لگا، وہ سوچ رہا تھا کہ آج بے وقت پہنچ کر اپنی بیوی کو چونکا دے گا، یا پھر سوتے میں گدگدا کر آنکھیں بند کر دے گا اور وہ حواس باختہ ہو کر چلانے لگے گی۔

وہ اپنی چھوٹی سی کوٹھی میں داخل ہوا۔ بتیاں جل رہی تھیں۔

"ابھی تک سوئی نہیں بیچاری" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "کبھی رشیدہ نے بھی میرا اس طرح انتظار کیا ہے"

رشیدہ! جو ایک مہینے سے اس پر مٹی جا رہی تھی اور اس دن کی بحث سے تو وہ اس پر بالکل مرمٹی تھی کئی دفعہ رشیدہ نے اس کو تنہائی میں محبت کے نغمے سنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہمیشہ اس کو ٹالتا رہا ——— ابھی پچھلے ہفتہ ہی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور ایک سہمی آہ کھینچ کر کہا۔

"جاوید تم کتنے ظالم ہو۔ تم نے اپنی بیوی کو تو پہچان لیا ہوگا مگر ایک کنواری کے احساس کو نہیں ٹٹول سکے"

وہ چونک گیا اس نے ہال کمرہ کا دروازہ کھولا۔ تو اس کی چونکاہٹ بالکل بے جان ہو کر رہ گئی۔ صوفہ پر راشد کا کوٹ پڑا ہوا تھا، شکوک نے اس کے دماغ کی کنپٹیاں بجانی شروع کر دیں۔

اس نے پاؤں سے جوتا اتارا اور بیڈ روم کی طرف اس طرح چلنے لگا جیسے کوئی بلی چوہے کے شکار کے لئے چلتی ہے۔ دروازہ بند تھا اس نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو دو قدم پیچھے ہٹ گیا، اور الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا، جوتا پہنا اور راشد کی کوٹھی کی راہ لی مکان کی بتیاں گل تھیں ——— اور جاوید کا سایہ اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

دوسرے دن راشد کے مکان میں حمیدہ، راشد اور امجد بیٹھے سرگوشیاں

کر رہے تھے۔

"آخر یہ دونوں کہاں گئے" حمیدہ نے بےچین ہو کر پوچھا، مگر راشد خاموش تھا۔

"تم کہاں تھے کل رات راشد" امجد نے پوچھا،

"میں۔ ۔ ۔ ۔ میں تو نائٹ شفٹ پر تھا" راشد امجد سے جھینپ گیا۔

"بکتے ہو تم ——" امجد بولا۔

"یہ میرے پاس تھے۔ رات بھر میرے پاس رہے —— وہ آئے ہوں گے انھوں نے دیکھ لیا ہوگا —— ضرور دیکھ لیا ہوگا، خدا کے لئے انھیں ڈھونڈو میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی —— میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اُف راشد، حمیدہ رونے لگی، اس کی آنکھیں، احساس شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔

حمیدہ!" راشد نے چونک کر کہا۔

"ہوں"

"اب وہ نہیں آئے گا۔ اس نے کہا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میری بیوی مجھے نہیں چاہتی تو میں اس کو اس کا حق دے دوں گا۔ ہر انسان کو زندگی کے لمحے حسین جلانے کا حق ہے، زندگی ہر بار اپنے لئے نئی راہیں نکال لیتی ہے، یہ زندگی نئی راہوں سے بٹی پڑی ہے —— مگر کمبخت نے میری بہن ہی کو کیوں اپنی نئی راہ بنا لیا۔

راشد نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"انتقام"! امجد بول اٹھا۔

انتقام! ـــــ نہیں امجد خدا کے لئے ایسا نہ کہو ـــــــ"

اُنھیں بُلا لو مجھے راشد سے نفرت ہے شدید نفرت، یہ کم ظرف ہے ـــ

ذلیل ہے ــــ خدا کے لئے ــــ . . . .

اُف امجد بھیّا زندگی کتنی بھیانک ہو جائے گی اُن کے بغیر ـــــ ان کو

بلا لو ـــــ میں یہ ردِّ عمل کبھی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ کبھی نہیں، رشیدہ نے

انھیں۔ . . . . . .

. . . . اف راشد میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں اُنھیں بلا لو ـــــ

انھیں بلا لو۔ بلا لو!!!"

حمیدہ کی آواز ہچکیوں میں گھٹ گئی اور امجد کو محسوس ہوا کہ دور اُفق کے

اس پار جاوید اور رشیدہ قہقہے لگا رہے ہیں۔

طویل اور خوفناک قہقہے۔ امجد کی روح لرز گئی۔ اور راشد نے اپنے کمرے

میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ یہ ذلیل ہے ــــ مجھے اس سے نفرت ہے ـــ

اُنھیں بلا لو ــــ اُنھیں بلا لو ــــ ردِّ عمل انتقام ــــ حسین لمحے . . . .

اور فضا میں خوفناک ہچکیاں ابھرتی رہیں۔

میں شریف ہوں

"افسانہ لکھو" وہ بولی۔

"گویا مصالحہ پیسوں"

"یہ کس نے کہا وہ چڑ گئی۔

"تمہارے نزدیک افسانہ لکھنا اور مصالحہ پیسنا برابر ہے"

"بلکہ افسانہ لکھنا زیادہ آسان ہے" وہ مسکرائی۔

"اچھا تم ہی ایک افسانہ لکھدو"

"اور تم ذری مصالحہ پیس دو"

"تمہارے سر میں گدھے کا دماغ ہے۔

"گدھا بہت عقلمند جانور ہے" وہ سر کھجا کر بولی۔

"خدا مبارک کرے"

"اچھا اچھا اب افسانہ لکھو" وہ لاجواب ہو گئے۔

"عجیب عورت ہو تم"

"عورت ہمیشہ عجیب ہوتی ہے"

"دنیا کا دسواں عجائب"

"اوں۔ ہونھ۔ سب سے پہلا۔ وہ ایک انگلی کھڑی کر کے بولی"

"چائے نہیں پلاؤ گی"
"پہلے افسانہ لکھو" وہ بولی۔
"میں گراموفون تو نہیں ہوں"
"بہت ضدی ہو تم"
"وہ کیسے"
"جب میں کہتی ہوں تم لکھتے نہیں" وہ منہ پھلا کر بولی۔
"میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں"
"جھوٹ"
"اچھا یوں ہی سہی۔ وہ کتاب دینا ذرا"
"مگر یہ تو بہت پرانی ہے اس نے کتاب اٹھا کر کہا"
"تمہیں معلوم کچھ دنوں کے بعد پرانی کتاب۔ اور پرانی محو . . . . . "
"بکواس" وہ اٹھ کر اپنے پلنگ پر چلی گئی۔
"کیا پڑھ رہے ہو" وہ خاموش نہ رہ سکی۔
"رضائی"
"رضائی"؟ اس نے حیرانی سے پوچھا۔
"ہاں ـــــ ار ـــــ نہیں لحاف"
"بہت سردی ہے کیا"
"بہت" وہ سُن کر اپنے لحاف میں دبک گئی۔

"میں نے بھی پڑھی تھی" وہ اندر ہی سے بولی۔

"کیا؟"

"منٹو کی کالی شلوار"

"بہت غلیظ ہے"

"اور سحاف" اس نے پوچھا۔

"یہ کوک شاستر ہے"

"کوک شاستر؟"

"ہاں ـــــ یہ سب کوک شاستر ہی تو ہیں، لکھی لکھی"

ارے تم ہنس کیوں رہے ہو"

ایک بات یاد آگئی ہے"

"کون سی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی"

"جب میں چھوٹا سا تھا، میرا مطلب ہے جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا. . . . ."

"جب تم اپنی ناک کوٹ کی آستینوں سے پونچھ لیا کرتے تھے"

اس نے چھیڑا۔

"سنتی بھی ہو تم"

"کہو"

"میں کوک شاستر پڑھا کرتا تھا"

"پھر"

اس پر کاغذ چڑھایا کرتا تھا اور اوپر لکھدیا کرتا تھا۔ تاریخ انگلستان ——

ابّا میاں کہتے بیٹا بڑا محنتی ہے خوب پڑھتا ہے۔"

"اور اسی لئے تم فیل ہو جایا کرتے تھے"

"بکتی ہو تم میں کبھی فیل نہیں ہوا —— ہیڈ ماسٹر ابا جان کا دوست تھا"

"اچھا پھر" وہ بولی۔

"میرا مطلب ہے سب افسانے اچھے عنوانوں کے ساتھ خوبصورت الفاظوں میں چھپے ہوئے کوک تنا شتر ہیں۔ جن پر خاکی کاغذ چڑھا کر پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی"

"میں پوچھتی ہوں۔ افسانہ کیوں نہیں لکھتے، کتنے خط آئے پڑے ہیں" اس نے پھر اصرار کیا۔

"آنے دو خطوں کو —— میں گندے افسانے نہیں لکھ سکتا۔ میں شریف آدمی ہوں"

"تو کچھ لکھو گے بھی"

"میں اکثر سوچتا ہوں"

"کیا"

"یہی کہ اچھے بھلے افسانہ نگار، بیٹھے بٹھائے، گندے افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے پاس کوئی اچھا پلاٹ نہیں ہوتا —— دیکھو نا یہ رضائی ——"

رضائی نہیں لحاف — عصمت کا ہے نا۔"

"خیر لحاف ایک ہی بات ہے — بخدا متلی آنے لگتی ہے۔ مجھے پڑھ کر اور یہ

دہواں، پڑھا ہے نہ تم نے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کا کچا گوشت دانتوں

میں کچکچا رہا ہے — یعنی . . . . گویا یہ لوگ بھوکے ہیں۔

بھوکے ہیں" وہ حیرانی سے بولی۔

اب کچھ ایسا ہی لگتا ہے — یہ لوگ بھوکے ہیں اور قلم کے ذریعہ گندے الفاظوں

میں لپیٹ کر اپنے پرانے معاشقوں کو نگلتے رہتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر عورت

ننگی ناچتی رہتی ہے۔"

اور عصمت!"

وہ عورت ہے تم اس کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی"

"وہ کیا ہے"

ہر انسان کے اندر خواہ وہ عورت ہو یا مرد پیدائش سے وہ خواہش ہوتی ہے ایک

پیٹ کی بھوک اور جنسی بھوک ہم انسان جب پیٹ سے بھوکے ہوتے ہیں تو ڈنکے کی

چوٹ واویلا کر کے اپنی بھوک کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں — روتے ہیں

مگر دنیا والے کچھ نہیں کہتے۔ مگر جب کوئی جنسی بھوک سے تڑپ کر ذرا سا بھی کچھ کہدے

دنیا والے گھبرا جاتے ہیں۔ قانون لرز جاتا ہے۔ مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ حالانکہ

دونوں بھوکیں ایک ہی قسم کی ہیں — دونوں کی شدت برابر ہے بلکہ جنسی بھوک

کی شدت پیٹ کی بھوک سے بہت زیادہ خطرناک" وہ لیکچر دینے لگی، اس کی آنکھوں میں خون کے سرخ ڈورے اُبھر آئے

"تم نے فرائیڈ کو پڑھا ہے"

"ہاں"

"تبھی بہکی جا رہی ہو"

"میں بہک نہیں رہی بلکہ انسانیت کے اس خطرناک ناسور کی دوا ڈھونڈ رہی ہوں جو اُسے جنسی بھوک کی بدولت ملا ہے اور وہ اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے —— یاد ہے تمہیں لکھنؤ کا وہ زمانہ ——"

"لکھنؤ کے خربوزے بہت لذیذ ہوتے ہیں"

"ہاں اب تم بغلیں جھانکنے لگے ہو —— یاد ہے تمہیں جب ایک دن تمہارے گھر کی بتی فیل ہو گئی تھی۔ تمہارے ابا —— امّی اور ممدو چچا اوپر بیٹھے ہوئے تھے اور تم نیچے کمرے میں پڑھ رہے تھے"

"ہاں یاد آ گیا۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور کوئی لالٹین تلاش کرنے میرے کمرے میں گھس آیا اور میرے اوپر ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا، جب میں نے اس کو دبایا تو میرے ہاتھوں میں سوئیاں چبھنے لگیں اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، ایسے جیسے ربڑ کی گڑیا کو دبانے سے نکلا کرتی ہے۔"

"اور آگے"

"آگے کچھ نہیں"

"اور وہ آدھے گھنٹے تک خود سپردگی کے عالم میں تمہارے پہلو میں پڑی رہی، جب بتی جلی تو تمہاری آنکھیں چندھیا گئیں تھیں، نعیمہ کی شکل دیکھ کر اور اس کے بعد . . . ."

"اس کے بعد کیا"

"اور اس کے بعد نعیمہ کئی مرتبہ اندھیرے میں تمہارے پاس آئی اور . . . . "

"اب بس بھی کرو تم۔"

"اب یہ گندے افسانے تمہیں کیسے لگتے ہیں۔"

"اچھا بھئی ماما اب چار پلاؤ۔" وہ اٹھ کر چلی گئی، تھوڑا عرصہ سکوت رہا ــــــ "

"اب کیا پڑھ رہے ہو"

"خلط ملط"

"بہت نفسیاتی ادیب ہے مفتی" وہ چائے بناتے ہوئے بولا۔ ہاں بڑا نفسیاتی ــــ بلکہ اس سے بھی چار گھاٹ آگے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ کو ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے۔"

"خلط ملط میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ نہیں اس میں تو نہیں مگر ایسا ہے ضرور اور پھر یہ مرغا مرغی کا کھیل، استغفراللہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہنے کی۔"

"اس لئے تو اس نے نام رکھا ہے "ان کہی" اور تمہیں اس لئے چڑ لگتی ہے کہ تم خود ویسے ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"یعنی ان تمام افسانوں کا کریکٹر نظر آتا ہوں میں تمہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔"

"اور تم کالی شلوار کی . . . . ."

دیکھو جی اب تم اپنا کیچڑ مجھ پر اچھالنے لگے ہو ابھی میرٹھ کے محلّے تمہیں بھولے نہیں۔" وہ چڑ گئی۔

چپ رہو جی ـــــ مجھے سردی لگ رہی ہے ـــــ یہ دیکھو یہ ـــــ یہ دیکھو میرے ہاتھ سردی سے ٹھٹھرے جا رہے ہیں، میرے ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں۔ اور تم میرٹھ کی گلیاں یاد دلا رہے ہو۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں افسانہ لکھو افسانہ مگر تم سنتے ہی نہیں" وہ پریشانی سے بولی"

"پھر وہی ـــــ میں کہہ رہا ہوں ـــــ میں افسانہ نہیں لکھوں گا۔ نہیں لکھوں گا۔ تم ہی ذرا بتاؤ کیسے لکھوں افسانہ ـــــ یاد ہے گذشتہ ہفتہ جو لکھا تھا۔"

"ہاں وہ اوٹ پٹانگ۔"

ہاں وہی اور اس کے بعد میں کتنی دیر تک روتا رہا تھا۔ تمہیں نے تو پچکار پچکار کر چپ کرایا تھا۔ سچ، اگر تم نہ ہوتیں تو میں خودکشی کر لیتا۔

"خودکشی کر لیتے مگر ہوا کیا تھا"

"یہ تم نے پوچھا ہی کب"

"اب بتا دو"

"تم کو معلوم ہے کہ میں وہ افسانہ آدھی رات تک مسلسل لکھتا رہا تھا، اور تم نے چھ بار چائے بنا کر پلائی تھی ـــــ مگر وہ شاعر کا بچہ کسی افسانہ نگار کا بھلا ـــــ کیا نام ہے اس کا"

"کس کا؟"

"ارے وہی لاحول ولا، ارے بھئی وہی نادم"

"نادم کیا ہوا اس کو اچھا بھلا تو تھا وہ"

"اوہو میں کب کہہ رہا ہوں، جہنم رسید ہو گیا وہ آخر اس کو کیا حق تھا کہ میرے اور خالص میرے افسانے کو مال مسروقہ قرار دیتا، کمبخت کہتا تھا کہ فلاں روسی ناول کا چربہ ہے"

"تو اس میں رونے کی کیا بات تھی" وہ حیرانی سے بولا —

"یعنی تمہارا مطلب ہے کوئی بات ہی نہ تھی"

"میں گھنٹوں دردسری کرنے کے بعد افسانہ لکھوں اور کوئی نہایت اطمینان سے اس کو چوری کہہ دے، میں ریٹائرڈ ہوا کاٹ کا اُلّو ہو گیا یعنی . . . . . ."

"آجکل سب افسانہ نگار چوری تو کرتے ہیں ایک دوسرے کی"

"اوہ تو گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں بھی چوری کرتا ہوں خدا بچائے ! چھوٹوں سے گود میں بیٹھ کر داڑھی نوچتی ہو —"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے چوری کی اگر نادم نے کہدیا تو ہوا کیا — اس کا مطلب تو نہیں کہ تم لکھنا ہی چھوڑ دو"

"اور لو یک نہ شد دو شد — تمہارا خیال ہے کہ میں نے لکھنا چھوڑ دیا"

"تو پھر لکھو نا —" وہ اپنی فتح پر مسکرائی"

"لکھوں گا مگر ابھی نہیں — اس وقت میرے پاس کوئی پلاٹ نہیں —"

کوئی کردار نہیں۔"

"پلاٹ میں بتاتی ہوں۔"

"بتاؤ۔"

"میرٹھ"

"دیکھو تم بار بار میرٹھ کا نام کیوں لیتی ہو، آخر ہوا کیا تھا وہاں —— بھلا وہ بھی کوئی بات ہے لکھنے کی۔"

"تمہارے نزدیک ہوا ہی کچھ نہ تھا اور وہ جو ملا صاحب کی لڑکی ابھی تک تمہاری جان کو رو رہی ہے۔"

"میری جان کو ارے بھئی کس نے بہکا دیا ہو گا تمہیں

"تم اسی لئے تو لکھتے نہیں —— تمہاری زندگی گناہ کے سیاہ بادلوں سے پٹی پڑی ہے اور اس لئے یہ تمہیں یہ منٹو اور عصمت برے لگتے ہیں کیونکہ انھوں نے تمہارے اندر گھس کر تمہارے رازوں کو تم پر فاش کر دیا ہے تمہاری روح کے اندر رینگتے ہوئے کیڑوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھدیا ہے —— تم اسی لئے نہیں لکھتے۔ تم ڈرتے ہو کہ لوگ تمہاری جنسی بھوک کو محسوس کرکے تمہارے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ تم دنیا کو دھوکہ دینا چاہتے ہو تم شریفانہ اور مکاری سے بھرے ہوئے افسانے لکھنا چاہتے ہو۔ مگر لکھ نہیں سکتے، کیونکہ تمہاری زندگی میں خود کوئی اچھا پلاٹ نہیں —— تم منٹو کو پڑھتے ہو مگر اس کو برا کہتے ہو، کیونکہ اس نے تمہاری روح پر چڑھے شرافت کے لبادے کو چیر کر تمہیں سرعام لا پھینکا ہے

تم بزدل ہو تمہارا ادب بزدل ہے تم قانون سے ڈرتے ہو مذہب سے ڈرتے ہو۔ مگر نعیمہ کو اندھیرے میں لپٹاتے ہوئے نہیں ڈرتے۔ ملاجی کی لڑکی سے اپنی بھوک کو تسکین دیتے ہوئے نہیں ڈرتے، اور اب جب وہ لڑکی ایک جیتے جاگتے بچے کی ماں بن گئی ہے تم وہاں سے بھاگ نکلے ہو ـــــ تم گندے افسانے لکھنا نہیں چاہتے ـــــ اس لئے کہ تم شریف زادے ہو ـــــ وہ چلا رہی تھی۔

تم نے اچھی خاصی تقریر جھاڑ دی بھلا میرا کیا قصور تھا ـــــ وہ ملّا کی چھوکری خود ہی مری جا رہی تھی۔ اگر اس کی جانب سے پہل نہ ہوتی تو میری کیا مجال تھی ـــــ نہ جانے پچھلی باتیں کیوں لے بیٹھی ہو۔"

"تم بہت ہرجائی ہو"

کم از کم تمہارے معاملے میں بالکل مجنوں ہو گیا ہوں"

"کیوں بناتے ہو" وہ ہنسنے لگی،

"تم ہر بات کو الٹا دیکھنے کی عادی ہو چکی ہو"

"تمہاری صحبت کا اثر ہے"

"وقت کیا ہوا ہے"

ایک بجا ہے۔"

"اُف آدھی رات بیت گئی۔ آؤ اب سو جائیں ـــــ"

"اور افسانہ"

"میں گندے افسانے نہیں لکھتا میں شریف آدمی ہوں"

"کیا کہنے ہیں تمہاری شرافت کے"

"چلو نہ سہی ——— ادھر آجاؤ سردی زیادہ ہے"

"نہیں" وہ اپنے لحاف میں گھس گئی"

"میں شریف آدمی ہوں" اور وہ دیر تک یہی سوچتا ہو رہا؟

اور جنوں بڑھتا گیا

"کیا کر رہے ہو اجمل" نصرت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن اجمل خاموش تھا۔ اس کا سر ٹیبل پر جھکا ہوا تھا۔ کمرہ ساکت تھا۔ چیزیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں جیسے کسی دیوانے کا دیوان خانہ۔ باوجود قیمتی اور نفیس سامان ہونے کے کمرہ اداس تھا نصرت اس کی پشت پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا کر رہے ہو میں نے پوچھا تھا" نصرت نے دوبارہ چلا کر کہا۔

"سن لیا تھا میں نے" اجمل بولا۔

"اور جواب کیوں نہیں دیتے"

"کوئی فرض نہیں ہے" اجمل نے یوں ہی سر جھکائے جواب دیا۔

"بڑے بدتمیز ہو" نصرت نے تنک کر کہا۔

"شکریہ" اجمل بولا۔

"افیوں کھا گئے کیا آج"

"نصرت مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں پلاٹ سوچ رہا ہوں جاؤ اپنا کام کرو" اجمل جھنجھلایا۔

"اے توبہ! دن رات پلاٹ سوچا کرتے ہو۔ صبح شام لکھا کرتے ہو آخر تمہیں ہو کیا گیا" نصرت چڑ گئی۔

"ہوا تو کچھ نہیں تھا مگر اب کچھ ہو کر رہے گا۔"

"میں بلائے ناگہانی جو ٹھہری۔ مگر مجھے یہ بتاؤ کہ آخر یوں چپ محض بکنے سے کیا کام چلے گا۔ دو سال ہو گئے بی اے کئے ہوئے مگر ابھی تک نِچّے بنے بیٹھے ہو۔" نصرت نے آج پھر نانی اماں بننے کی ٹھانی۔

"نصرت تم بالکل بودی ہو۔" میں نے بی اے کیا ہے جانتی ہو بچلر آف آرٹ اور میرے خیال میں جو بچلر آف آرٹ ہو کر کچھ لکھتے نہیں وہ اول نمبر کا گدھا ہے۔" اجمل نے طعنہ دیا۔

"وہ کیوں"

"اس لئے کہ اس نے کالج میں پڑھا نہیں جھک ماری ہے۔ سمجھیں اور اگر تم بھی بی اے کے بعد بودی کی بودی رہیں تو میں سمجھوں گا کہ تم بھی جھک مارتی رہیں چار سال"

"میں تو کبھی نہیں لکھوں گی۔"

"کیا کہا کچھ نہیں لکھو گی اری میری بلّو تم لکھو گی اور ضرور لکھو گی اگر نہیں لکھو گی تو میں آج ماموں جان سے کہہ کر تمہارا پڑھنا بند کروائے دیتا ہوں۔" اجمل اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"آہا ہا کیا شان ہے حضور کی میرا پڑھنا بند کروا دیں گے جیسے انہیں کے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔" نصرت اٹھلائی۔

"چیلنج مت دو۔"

"کر دیکھو کوشش" نصرت نے کہا اور باہر بھاگ گئی اجمل دانت پیس کر پھر ٹیبل پر جھک گیا۔ کمرہ پھر ساکت ہو گیا۔ فضا پھر خاموش ہو گئی۔

اجمل امیر باپ کا لاڈلا بیٹا تھا۔ ماں کی آغوش سے بے بہرہ باپ نے بیوی مرجانے پر دوسری شادی اس لئے نہ کی تھی کہ لڑکے کے ساتھ بدسلوکی ہوگی، تمام دلچسپیوں کو اجمل کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اجمل کے صرف ایک ہی ماموں تھے جو نہیں کے یہاں عرصے سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ دونوں خاندان خوشحال تھے اجمل اور نصرت بچپن کے ساتھی تھے دونوں میں کبھی نہ بنتی، دونوں طبیعتیں جدا جدا تھیں دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

اجمل کو بی اے کئے ہوئے دو سال ہو گئے تھے دولت کی فراوانی کی وجہ سے فکر معاش سے بے نیاز تھا لکھنے کا شوق وہ بچپن سے لیکر جوان ہوا تھا۔ بی، اے کے بعد یہ شوق جنوں کی حد تک بڑھ گیا۔ یہ جنوں اس کے ماموں کو بہت کھٹکتا تھا باپ کے خیالات نے بیٹی پر بھی اثر کیا باوجود ادبی ذوق رکھتے ہوئے وہ لکھنے کو برا سمجھنے لگی۔ اس کے باوجود وہ اجمل کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ برعکس اجمل کے ابا ہر بات پر مسرور تھے۔ وہ لکھتا تھا ان کو چنداں فکر نہ تھی ادیب بھوکا مرتا ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر وہ تمام عمر بھی لکھتا رہے تو بھی اس کو فکر معاش کا بوجھ اپنے ادبی دماغ پر رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ لکھتا جا رہا تھا۔

وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتا تھا، بہت قریب سے وہ

چاہتا تھا کہ زندگی کی ان بے پناہ دشواریوں میں خود کو تحلیل کر دے۔ انسانیت کی سسکتی ہوئی روح کا پس منظر دیکھے، روتی ہوئی زندگی کے آنسو پونچھے۔ اور پھر وہ ایک علیحدہ ایک انفرادی شخصیت لے کر اٹھے اور آسمان ادب پر چھا جائے، تڑپتی ہوئی روحوں کا سہارا بنجائے وہ ادب کی انتہائی بلندیوں پر پرواز کرنا چاہتا تھا بیفکر ہو کر ابابیلوں کی طرح ہلکے اور مسرور کن نغمے لے کر۔ مگر نصرت؟ —— نصرت یہی ایک شخصیت تھی جو اس کو کبھی کبھی چونکا دیا کرتی تھی یہ حسین اور شریر لڑکی جو اس کے ایوان حیات میں زبردستی داخل کر دی گئی تھی، یہی ایک بات تھی جس سے وہ گھبراتا تھا۔ یہ بات اس کے تخیل سے ٹکراتی تھی۔ اس کے مقصد سے متصادم ہوتی تھی وہ بات تھی اس کی اور نصرت کی بچپن کی منگنی "یہ منگنی کیوں کر دی گئی تھی؟" وہ اکثر سوچتا "آخر والدین کو کیا حق ہے کہ وہ اس کو مجبور کر دیں کہ وہ نصرت کو چاہے۔ نصرت کو پیار کرے اگر وہ اس کو ناپسند کرے تو؟ تو کیا پھر بھی وہ اس کے گلے منڈھ دی جائے گی۔ یکایک اس کو محسوس ہوا کہ وہ نصرت سے نفرت کرتا ہے انتہائی نفرت وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو رسم و رواج کی بنا پر کسی کو چاہنے پر مجبور کر دیا جائے۔ "رسم و رواج" یہی تھا اس کا مقصد جس کو لے کر وہ اُٹھا تھا اس نے آج تک جو کچھ بھی لکھا تھا وہ رسم و رواج کے خلاف تھا۔ سماج کی وزنی زنجیروں کے خلاف، زبردستی کی شادیوں کے خلاف۔ بچپن کی منگنیوں کے خلاف مذہب کے اس بھاری کندھے کے خلاف جس پر لوگ بندوق رکھ کر داغتے ہیں۔ ان قاضیوں کے خلاف جو اندر گھس کر محض گھر کے گواہوں پر نکاح پڑھا دیتے ہیں۔

ان نوجوانوں کے خلاف جو خاندان کی ناک کا خیال رکھ کر اپنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں وہ مکمل باغی تھا۔ کیا وہ صرف تحریری طور پر ان رسومات کے خلاف ڈھنڈورا پیٹے گا کیا اپنی عملی زندگی کو رسومات کی نذر کر دے گا۔ نہیں وہ اپنے مقصد کے خلاف ہرگز قدم اٹھانے پر تیار نہ تھا!! اس کے لئے اس کو نصرت کو کھونا ہوگا اس نصرت کو جس کے متعلق اس کو اتنا بھی یقین نہ تھا کہ وہ اسے چاہتی ہے آج تک ان دونوں نے محبت کا احساس ہی نہیں کیا تھا انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور رسومات کے خلاف اس کا جنون بڑھتا گیا۔ نوجوان طبقے میں اس کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی تھیں بڑے بوڑھے اس کو گالیاں دے رہے تھے اور پھر ایک دن۔

"نصرت!" اجمل نے آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"نصرت!!!" وہ اور زور سے چلایا۔

"کیا ہے" ساتھ والے کمرے سے نصرت کی آواز آئی۔

"یہاں آؤ" اجمل نے کہا۔

"ابھی نہیں آؤں گی"

"نہیں آؤں گی۔ تمہیں آنا پڑے گا —— تم ضرور آؤ گی" اس نے کہا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کافی دیر گزر گئی اور نصرت ٹہلتی ہوئی کمرے میں آئی۔

"کیوں آئیں تم" اجمل نے تنک کر پوچھا اور نصرت پریشان ہو گئی۔

"اپنی کتاب لینے" نصرت بولی

"کتاب لینے" ــــ "کون سی کتاب؟"

"وہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی جو یہاں پڑی تھی۔" وہ اِدھر اُدھر کتاب تلاش کرنے لگی۔

"نصرت"

"آں۔" وہ چونکی

"نصرت کبھی تم نے سوچا ہے"

"کیا؟"

"یہی کہ تم خود کو اتنی محدود نہیں رکھ سکتیں جتنا ظاہر کرنا چاہتی ہو ــــ تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم میرے بلانے پر آئی ہو ــــ آخر کیوں۔ کیا میرے افسانے منتقل کرتے وقت تم نے یہ کبھی سوچا ہے کہ تم یہ کام میرے لئے کر رہی ہو ــــ اور اب بھی میں نے اپنے کام کے لئے بلایا ہے ــــ آخر یہ احساس کمتری کیوں۔" اجمل کہہ رہا تھا۔ مگر نصرت خاموش تھی۔

"نصرت!" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کیا تم حقیقت میں مجھ سے بعید رہنا چاہتی ہو۔ کیا تمہیں میرا کوئی کام اچھا نہیں لگتا کیا میرے افسانے لکھتے وقت تم مجبور ہوتی ہو۔ کیا تمہیں میں پسند نہیں ــــ بولو صاف کہدو۔" مگر نصرت اب بھی خاموش تھی۔ اسی طرح جامد! اور اجمل اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اس کو محسوس ہوا کہ نصرت مغرور ہے وہ اس کو نہیں چاہتی وہ فریب دے رہی ہے۔

"آج تم بہکے جا رہے ہو آخر بات کیا ہے۔" نصرت بولی اور دوسری طرف منھ

پھیرلیا۔

بہکا نہیں جارہا ہوں نصرت۔ مجھے فیصلہ کرنا ہے۔"

"فیصلہ کا ہے کا" وہ چونک کر بولی۔

"مستقبل کا" اجمل بہت سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"خودکشی کا ارادہ ہے"

"مذاق نہ کرو"

"بھرتی ہو رہے ہو"

"نہیں"

"تو پھر ایکٹنگ سیکھ رہے ہو" وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

"نہیں نصرت، تم میری باتوں کا جواب دو اور بس" اجمل چڑ گیا۔

"تم نے مجھے کیوں بلایا تھا" نصرت بولی۔

"کچھ نہیں صرف یہ مسودہ نقل کردو" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اور نصرت مسودہ لے کر چلی گئی۔ اور اجمل خیالات کے گہوارے میں ڈوب گیا۔ کچھ دن بعد گھر میں جیسے کھچڑی پکنے لگی ہر طرف کھسر پھسر ہونے لگی۔ ہر طرف سرسراہٹ ہونے لگی، کونے کونے میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اور پھر اسی دن شام کو کچھ عجیب سی مسکراہٹوں نے کھانے کی میز پر اس کا استقبال کیا، مسکرانے والے وہی لوگ تھے۔ والد ماموں اور اس کی امی مگر آج ان کی مسکراہٹ واقعی عجیب تھی نصرت البتہ خاموش تھی۔

"آؤ بیٹا بہت دیر سے کھانے پر آتے ہو" اس کے ابا نے کہا۔

"جی معاف کیجئے گا ذرا یوں ہی دیر ہو گئی" وہ بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھانا شروع ہوا۔

"بیٹا اب تم جوان ہو چکے ہو" اس کے ابا نے کہا اور اجمل سوچنے لگا کہ آج ابا جان کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ جوان ہو چکا ہے حالانکہ وہ خود کو بوڑھا سمجھ چکا تھا۔

"جی!" اس نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا خیال ہے کہ اب تم شادی کر لو تاکہ ہم اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں"

"جی مگر....." اجمل رک گیا۔

"ہاں ہاں کہو بیٹا" ابا نے پوچھا

"جی میرا خیال ہے کہ فی الحال آپ اس بات کو کچھ عرصے کے لئے التوا میں ڈال دیں" اجمل نے آخر کہہ ہی دیا۔ اور نصرت اٹھ کر چلی گئی

"بیٹا بہت انتظار کیا ہم نے اب تو میرے بال بھی سفید ہو گئے ہیں" اس کے ابا نے پریشان نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا اب دیر نہ ہونی چاہیئے" اس کے ماموں نے بھی تائید کی۔

"مجھے شادی سے نفرت ہے اور بالخصوص ایسی شادی سے جو رسومات کے ریتلے میدان پر تعمیر کی جائے" اجمل نے آج کرنے کی ٹھان لی تھی

"اجمل بیٹا کتابی باتوں کو اپنی زندگی سے وابستہ نہیں کرنا چاہیئے" اس کے

ماموں نے کہا۔

"جی میری کتابیں میری زندگی ہے۔ میری زندگی ان میں محرک عمل ہے۔ میں دنیا کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ میں وہی کروں گا جو کچھ لکھتا ہوں۔" اجمل گرم ہو گیا۔

"مگر بیٹا نصرت سے تم بچپن سے وابستہ ہو۔" اس کے ابا نے کہا۔

"اور اسی لئے میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"اجمل۔" اس کا باپ بگڑ گیا، "تم خاندان کی ریت کے خلاف جا رہے ہو، تم اپنے آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنی اندھی جوانی کی راہ لگا کر ان کو بدنام کر رہے ہو۔ اجمل تم بہت سعادت مند ہو مجھے تم پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ اپنی زندگی کے بہترین لمحے میں نے تمہارے لئے وقف کر دیئے۔ اس لئے نہیں کہ آج تم میری پگڑی اچھالو۔"

"ابا جان"

"میں کچھ نہیں سنوں گا۔ جاؤ کل سوچ کر جواب دینا۔" اجمل اٹھ کر چلا گیا۔ اور اپنے بستر پر جا کر مستقبل کا جال بننے لگا۔

ایک طرف وہ تھا اس کا مقصد اس کا ادب اس کی عزت، دوسری طرف نصرت جس کو وہ نہ پسند کرتا تھا نہ نفرت کرتا تھا۔ اور خاندان کی عزت اور وقار وہ زندگی کے ایسے چوراہے پر آ کر کھڑا تھا جہاں پر کئی راہیں ہوں وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی خاندان کی عزت کا خیال کبھی اپنے مقصد کے حصول کا تصور!

صبح جب وہ اٹھا تو وہ فیصلہ کر چکا تھا نصرت اس کو نہیں چاہتی تھی اس لئے

اس کو قربان کر دینا آسان تھا مگر اپنے مقصد کی قربانی اس کو پسند نہ تھی۔ اس کا جنون اس کے خاندانی وقار پر قابض ہو گیا اور اس نے فیصلہ صادر کر دیا۔ گھر بھر میں اداسی چھا گئی۔ ہر طرف مکمل جمود طاری ہو گیا ہر فرد کے چہرے پر مٹی جم گئی "اجمل نے نصرت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا" گھر کے در و دیوار سرگوشیاں کر رہے تھے مگر کسی کو اجمل کے خلاف ایک لفظ کہنے کی جرات نہ ہوئی بنک کا تمام سرمایہ اجمل کے نام تھا۔ تمام جائداد اس کے نام لکھی ہوئی تھی، پھر بھلا کسی کو کچھ کہنے کی جرات ہو سکتی تھی وہ خوش تھا اس نے اپنے خواب کی تعبیر کے لئے اپنے ہی گھر کو چن لیا۔ کچھ دنوں بعد نصرت کی منگنی ایک پروفیسر کے ساتھ کر دی گئی۔ مگر کسی کو اس منگنی سے مسرت نہ ہوئی گھر سے خوشی رخصت ہو چکی تھی۔ مگر اجمل کا چہرہ مسکرا رہا تھا اس کی آنکھیں شوخ تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کے پس پردہ بے پناہ رنج کروٹیں بدل رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی شوخی میں خلا ہے، جب وہ کسی کی جانب دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے وہ دور کہیں افق میں جھانک رہا ہے۔ بہت دور گمشدہ منزل کی طرف۔

شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی، بارات آئی شہنائیوں اور ڈفریوں کا شور بڑھتا گیا۔ اور اجمل ایک کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس کو نصرت سے ملے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا وہ خود ہی اس سے کتراتا رہا۔ اور آج جب اس کا اس گھر میں آخری دن تھا وہ سوچ رہا تھا کہ نصرت کو الوداعی سلام کہدے، بارات بیٹھ چکی تھی یکایک اس کو کسی کے پاؤں کی ہلکی چاپ سنائی دی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا نصرت کھڑی

"نصرت تم!" نصرت دلہن بنی ہوئی۔

"جی میں ہوں۔" نصرت کی آواز خلا میں گونجی اس نے نصرت کو بغور دیکھا وہ کتنی بدل چکی تھی اس کے چہرے کی شگفتگی رخصت ہو چکی تھی آنکھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانی مریضہ کی آنکھیں ہیں۔

"نصرت معلوم ہوتا ہے تم خوش نہیں ہو۔" اجمل نے کہا۔

"آپ کو یہ سوال نہ کرنا چاہیئے تھا۔" نصرت نے جواب دیا۔

"کیوں۔"

"آپ کو میری خوشی اور غم سے کیا واسطہ۔ میں یہ مسودہ دینے آئی ہوں میں اس کو مکمل نہ کر سکی معافی چاہتی ہوں۔" نصرت نے کاغذ بڑھا دیئے اور ساتھ ہی اس کے آنکھوں سے دو قطرے گر گئے۔

"نصرت تمہیں خوش ہونا چاہیئے پروفیسر اچھا آدمی ہے۔" اجمل بولا۔

"ہاں پروفیسر اچھا آدمی ہے آپ بھی اچھے آدمی ہیں۔ آدمی سب اچھے ہوتے ہیں۔" نصرت آنسو ضبط کر رہی تھی

"نصرت تم آج پھر دھوکہ دینے آئی ہو۔ آج پھر مجھے ماضی کی جانب گھسیٹنے آئی ہو۔ کاش تم سمجھنے کا موقع دیتیں۔"

"آپ نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آپ نے مجھے قریب سے نہیں دیکھا۔ آپ کو آپ کا مقصد عزیز تھا اس لئے مجھے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا تھی آپ انسانیت کی روح کی چیخوں کو سن سکتے تھے نصرت کے دل کی دھڑکن نہ سن سکے آپ۔

آپ کا قلم زندگی کے ناسوروں پر نشتر زنی کرتا رہا مگر میرے سینے کے زخم کو محسوس نہ کر سکا آپ ادیب ہیں مجھے آپ سے شکایت نہیں۔" نصرت بلکنے لگی۔

"مت کہو نصرت مجھے سوچنے دو۔" اجمل نے سر پکڑ لیا۔

"اب سوچنے سے کیا ہوتا ہے"

"سب کچھ ہو سکتا ہے سب کچھ ہو گا۔" اجمل نے کہا اور باہر چلا گیا۔

باہر براتیوں کا ہجوم تھا ہر طرف چہل پہل لوگ نکاح کی تکمیل کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر جب نکاح کا وقت آیا نصرت اور اجمل کے ابا اندر ان دونوں کو تلاش کر رہے تھے۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر نہ نصرت تھی نہ اجمل۔ خبر بڑھی اور بڑھتے بڑھتے براتیوں میں پہنچ گئی۔ پہلے سرگوشیاں ہوئیں اور پھر ہر طرف لعنت ملامت شروع ہو گئے۔

"یہ شریف گھرانہ ہے"

"اجی مغربی تعلیم کا اثر ہے"

"مگر صاحب وہ تو اس سے انکار کر چکا تھا۔"

"آج کل کے لونڈے سر پھرے ہوتے ہیں۔"

"خدا بچائے" وغیرہ وغیرہ۔ جتنے مُنھ اتنے بول۔ نصرت اور اجمل کے ابا کا غصہ اور شرم سے برا حال ہو رہا تھا۔ اجمل کے ابا اس کے سونے کے کمرے میں پہنچے۔ میز پر لفافہ پڑا تھا انھوں نے کھولا۔

اچھے ابا۔ تسلیم۔

زندگی کے اسٹیج پر بہت سے ڈرامے ہوتے ہیں سماج آج تک ایک ہی ڈرامہ کھیلتا آیا ہے اس کے ہیرو اور ہیروئن ہر دور میں سسکیاں لیتے رہے ہیں میں نے اس ڈرامہ کو ختم کرنا چاہا تھا۔ زندگی کے بندھنوں کو توڑنا چاہا تھا اور توڑ دیا۔ میں نے انسانی زندگی کے اس جاہل کھیل کا منھ توڑنا چاہا تھا اور آج اس کے منھ کا گوشت میرے ناخنوں میں ہے۔

میں خوش ہوں کہ میں نے نصرت کی زندگی کو سسکیوں سے بچا لیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مقصد کو بھی حاصل کر لیا۔ کل جب اخبارات میں یہ خبر نکلے گی کہ "اجمل" ادیب نے اپنے خاندان کے وقار پر ایک کاری ضرب لگائی ہے تو میرے افسانے پڑھنے والے خوشی سے ناچ اٹھیں گے۔ اور آپ کو یہ ملال جو آپ کو وقتی طور پر محسوس ہو رہا ہے بہت جلد درست ہو جائے گا۔ میں یہیں شہر کے ہوٹل

میں ہنی مون منانے جا رہا ہوں۔ انشاءاللہ جلد ملاقات ہوگی۔

پروفیسر صاحب کو ان کے اخراجات کا چیک کاٹ کر دے دیں۔

آپ کا اپنا

اجمل

اس کے ابا نے خط پڑھا "جنونی!" وہ بڑبڑائے۔

اور وہ سوچتا رہا

اس نے کمرہ میں قدم رکھا اور اس پر اداسی کا وہی دورہ پڑ گیا جو اکثر روزانہ پڑا کرتا تھا۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اداسی کی موٹی جھرٹیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ آتے ہی صوفہ پر اس طرح گرا جیسے ہارا ہوا جواری۔ اس کے پیٹ میں بھوک نے بری طرح کھلبلی مچا رکھی تھی۔ آج بھی وہ کھانا کھا کر نہیں آیا تھا وہ اسی توقع میں گھر پہنچا کہ بیگم انتظار کر رہی ہو گی اور آتے ہی کہے گی "کھانا کھائے گا" مگر اس کی امید محض امید ہی رہی اس نے دیکھا بیگم بے نیاز آنکھیں بند کئے سو رہی ہے اور اس کی نظریں بیگم کے چہرے پر جم گئیں۔

ہاں یہ وہی چہرہ ہے جو آج سے ۳ سال پیشتر اس کی نگاہوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ یہ وہی چہرہ ہے جس کے لئے وہ ترس جایا کرتا تھا۔ یہ وہی آنکھیں ہیں۔ جن کی تعریف میں شعر کہا کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں ان آنکھوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ان میں مستقبل کے خواب دیکھا کرتا تھا حسین اور عجیب عجیب پرلطف خواب! جب وہ کنوارا تھا تب بھی یہ خواب اس کی زندگی کا بہترین سرمایہ تھے جب اس نے سنا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے تو وہ عجیب الجھن میں گرفتار ہو گیا ایک کشمکش ایک جستجو "اس کی بیوی کیسی ہو گی" وہ سوچتا "ایک

حسین دوشیزہ کا روپ دھار لیتا ایسی دوشیزہ جو شاید اس نے کبھی نہ دیکھی تھی اور پھر وہ دوشیزہ مسکراتی ہوئی بڑھتی اور وہ خود کو اس کے اندر سمو دیتا۔ اور پھر یکایک ___ وہ حسین دوشیزہ کے جسم سے باہر نکل کر اس کے گرد اوکا جائزہ لینے لگتا۔ اسے یاد آگیا سنہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ اس کا دوست ربانی ___ حسن ربانی اس کو اکثر کہا کرتا تھا

"رینو! تمہیں معلوم ہے میری بیوی کیسی ہے۔ اللہ قسم کیا بتاؤں۔ ایسی بیوی خدا سب کو دے۔ کس قدر خیال رکھتی ہے میرا۔ صبح اٹھتا ہوں غسل کا تمام سامان تیار ملتا ہے۔ ہر چیز ___ کسی چیز کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور غسل سے فارغ ہوتے ہی ناشتہ تیار ملتا ہے پاس بٹھا کر کھلاتی ہے ناشتہ کیا اور کپڑوں کی باری آئی۔ اللہ قسم کتنا شعور ہے اس میں بس کہدیا براؤن سوٹ پہنوں گا۔ اور براون سوٹ کے ساتھ میچنگ، شرٹ ٹائی ساکس۔ سب کچھ ملجاتا ہے۔ اللہ قسم لطف آجاتا ہے شادی کے بعد۔ جلدی سے کروا ڈالو شادی ہاں" ربانی کہے جاتا اور اس کو ربانی کی زندگی پر رشک آنے لگتا۔ ایک دن تو اس کا دل چاہا کہ ابا سے کہدے کہ شادی بجائے اگلے سال کرنے کے آج کر ڈالے ادھر ربانی جاتا تو زبیری آجاتا۔ اور بڑے چٹخارے لیکر اپنی اہلیہ کی تعریف کرتا۔

"سُن رہے ہو رینو بیٹا" لفظ "بیٹا" پر وہ خاص طور سے زور دیتا "تمہاری بھابی نے آج غزل لکھی ہے۔ بخدا لطف ہی تو آگیا اور کیا ترنم سے گائی ہے۔

جھوم جھوم گیا میں۔"

"شفو نے لکھی تھی غزل۔" رینو نے حیرانی سے پوچھا۔

"اور کیا میں کسی اور کا کہہ رہا ہوں بے۔" زبیری جھنجھلایا۔

گویا شاعر کو شاعرہ مل گئی۔" رینو بولا۔

"شاعرہ ہی نہیں رینو، بلکہ زندگی کے معمہ کا حل بھی۔"

"کیا مطلب۔" رینو نے پوچھا۔

"کیا مطلب لاحول ولاقوہ گویا تم اتنی سی بات کا مطلب نہیں سمجھے، ارے بھئی میری شفو نے مجھے زندگی کی بہت سی گتھیوں سے بچا لیا ہے، اب میں اپنا مقطع سنانے کے لئے تمہارے پاس دوڑا نہیں آؤں گا۔ اب مجھے اپنی کتابوں کے کھو جانے کا گلا بھی جاتا رہا۔ بخدا زندگی جنت بن گئی ہے۔"

"جنت"

"ہاں اگر اچھی بیوی ملے تو زندگی جنت ورنہ جہنم۔" زبیری نے مسکرا کر کہا۔ ابھی یہیں تک سوچا تھا کہ رینو کی نظر اپنی سوتی ہوئی بیگم کے چہرے پر جا رکیں۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جائے، اس نے قمیض اتاری اور وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے پھر سوچنے لگا۔ وہ پھر ماضی کی جانب فرار ہو گیا۔ اس کا ماضی کتنا درخشاں تھا اسے اچھی طرح یاد ہے وہ کرمانی سے ملا ہاں مس کرمانی سے وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ باغ میں ٹہل رہی تھی اور وہ سامنے کی بینچ پر بیٹھا اخروٹ کھا رہا تھا۔ کرمانی نے اِدھر اُدھر بیٹھنے کی جگہ تلاش کی۔ مگر کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اس

روزانہ جانے وہ اتنا دلیر کیسے ہو گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"یہاں بیٹھئے" اور خود اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مس کرمانی نے اس کی طرف دیکھا۔

"شکریہ" کرمانی نے کہا اور بیٹھ گئی۔

"آپ نہیں بیٹھے گا" اس نے رینو سے پوچھا۔ اور رینو بلا کچھ کہے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ کرمانی بھی چپ تھی وہ کبھی کبھی اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ لیتی۔ دونوں بات کرنے کا موضوع تلاش کر رہے تھے۔

"اخروٹ کھائیے" رینو نے یکایک اخروٹ نکال کر کرمانی کی طرف بڑھا دیئے۔

"او تھینک یو" کرمانی نے خوشی سے جواب دیا۔ اور توڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ رینو نے فوراً ایک اخروٹ توڑا۔ اور اس کی طرف بڑھایا۔ کرمانی نے مسکرا کر لے لیا۔ دونوں کھانے لگے کچھ دیر یوں ہی سکوت رہا۔

"بہت خوشگوار جگہ ہے" کرمانی نے آخر خود ہی کہا۔

"جی! . . . . . جی ہاں بہت" رینو جھجک کر جھنجلایا۔

"میں تو روز ہی آتی ہوں یہاں"

"اور میں بھی" رینو نے ایک اخروٹ توڑ کر کرمانی کی چھوٹی بہن کی طرف بڑھایا۔

"آپ یہیں کے رہنے والے ہیں" کرمانی نے پوچھا۔

"جی نہیں چند دن ہوئے آیا ہوں — میرا مطلب ہے دو مہینے"۔

"مجھے تو صرف پندرہ دن ہوئے ہیں آئے ہوئے"

"آپ کالج سے آ رہی ہیں"۔

"جی ہاں"

"مجھے بھی کالج چھوڑے صرف چند مہینے ہوئے ہیں کاروبار میں جُت گیا ہوں"۔ رینو کھل گیا۔

"افسوس تو بہت ہوگا۔ مجھے تو ہے۔ کالج کی لائف بہت دلچسپ تھی۔ آپ کا نام کیا ہے"؟

کرمانی بھی کھلی جا رہی تھی

"جی مجھے —— میرا نام تو بڑا لمبا ہے ویسے مجھے رینو کہتے ہیں"۔

"آج کل نام مختصر ہونے چاہئیں۔ زندگی بھی تو مختصر ہو گئی ہے"۔

"جی ہاں زندگی بہت مختصر ہو گئی ہے —— آپ کا نام ——"

رینو بے ڈھنگی گفتگو کر رہا تھا۔

"کرمانی —— مس کرمانی"۔ کرمانی نے اپنے مس ہونے پر زور دیا۔ اندھیرا کافی ہو گیا تھا دونوں اُٹھے۔ اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کرمانی کی چھوٹی بہن زیبو چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ اور کبھی کبھی رینو کی طرف اجنبی نگاہوں سے دیکھتی تھی —— سارا راستہ وہ خاموش رہے۔ جب موڑ پر پہنچے تو دونوں رُک گئے۔

"آپ کدھر رہتے ہیں؟" کرمانی نے پوچھا۔ اور انھوں نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

"میرا بنگلہ تو ادِھر ہے آیئے ذرا بیٹھیں گے —— ڈیڈی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے کرمانی نے قدم بڑھایا اور ربنو کا دل دھڑکنے لگا۔ کتنی آزاد لڑکی ہے ڈیڈی سے ملاقات کروانے چلی ہے۔ کچھ دور وہ اس کے ساتھ چلا اور رُک گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"سنیئے مجھے ضروری کام یاد آگیا ہے۔ کل چلوں گا" اس نے کہا۔

"ضروری کام —— اچھا" کرمانی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"اچھا" وہ واپس ہوا۔

"بائی بائی" کرمانی نے ہاتھ ہلایا۔

"بائی بائی" وہ جلدی جلدی قدم بڑھانے لگا۔ وہ اتنا گھبرا چکا تھا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس کا سلسلہ تصور ٹوٹ گیا۔ ماضی سے پھر حال کی طرف لوٹ آیا۔ اس کی بیگم نے کروٹ بدلی پلنگ چرچرایا۔ اس نے سگرٹ سلگایا باہر ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ اس کو بہت بری لگ رہی تھی۔ اس کے پیٹ کی بھوک اور تیز ہو گئی وہ اٹھا اِدھر اُدھر دیکھا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی ننھے کے لبسکٹ الماری سے نکال لئے اور کھانے لگا اور لبسکٹوں کی کچر کچر کے ساتھ وہ پھر پیچھے لوٹا۔ کرمانی کی یاد آج اس کو بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ اس کو یاد تھا کہ وہ باوجود وعدہ کے دو دن تک پارک میں نہیں گیا، اسکو

کرمانی کے ڈیڈی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کیسے آدمی ہوں گے کیا کیا سوال کریں گے۔ اس کو خوف تھا ایک لاشعوری خوف۔ مگر تیسرے دن وہ نہ رہ سکا اور پارک میں پہنچکر اسی بینچ پر جا رکا۔ کرمانی بیٹھی اخروٹ کھا رہی تھی۔

"کہاں تھے آپ" کرمانی نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

"یوں ہی نہ آسکا" رینو کو کوئی بہانہ نہ سوجھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اور باتیں ہونے لگیں۔ اب تو اس کو وہ باتیں یاد نہ تھیں۔ بہرحال باتوں میں اُنسیت تھی ہمدردی تھی۔ پیار تھا اور پھر کرمانی اس کی رگوں میں تحلیل ہونے لگی پیار بڑھتا گیا۔ کرمانی کی محبت نے اس کو عورت کے بارے میں عجیب سا احساس دیا تھا، اس کی محبت اس قدر شدید تھی کہ وہ کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا —— دن رات کرمانی اور وہ کلب ڈانس ہال۔ پارک۔ سینما۔ گھر۔ پکنک —— زندگی میں مسرتوں کے موتی بڑھتے جا رہے تھے۔ یہ اس کی پہلی محبت تھی اور کرمانی پہلی لڑکی تھی۔ کرمانی دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ بے باک تھی، ڈانس کرتے کرتے بوسہ لینے سے نہیں چوکتی تھی۔ وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا تھا کرمانی کے جوش پیار نے اس کو دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دے دی تھی وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عورت اتنی شدت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔

مگر اس کے سینے میں ہمیشہ ایک خوف کروٹیں لیتا رہا ایک درد آلود خوف کیونکہ وہ بچپن سے ساحرہ سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ اور بچپن ہی سے وہ ساحرہ

کو کچھ کچھ پسند کرنے لگا تھا۔ اگرچہ ساحرہ کو دیکھے ہوئے چھ سال گذر چکے تھے مگر جو نقوش ساحرہ نے اس کے دل میں چھوڑے تھے وہ بہت دلکش تھے بہت حسین تھے۔ اور پھر خاندان کے خلاف وہ قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے ایک روز اس نے کرمانی سے صاف کہدیا کہ وہ اینگیج ہو چکا ہے اس لئے اس سے شادی نہیں کر سکے گا۔ چند دنوں کے لئے کرمانی افسردہ رہی اس سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ مگر پھر وہی جنوں عود کر آیا۔ اور کرمانی نے اسی طرح ملنا جلنا شروع کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ چکے تھے اس لئے وابستگی بڑھ گئی۔

اس کا تسلسل ٹوٹ گیا، ننھے نے رونا شروع کر دیا اور اس کی ساحرہ نے اٹھ کر ننھے کے منہ میں چوسنی ٹھونس دی۔ اس نے رینو کی طرف دیکھا وہ پھر کروٹ بدل کر سو گئی۔ ایسے بے نیاز جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ کوئی پرواہ ہی نہیں۔ اور رینو کا دل سلگنے لگا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اس کی روح میں بے شمار کانٹے چبھے ہوئے ہیں۔ وہ درد سے کسمسانے لگا۔ اس کا ضمیر ماحول کی بے ترتیبی کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کا سا بھبھوکا باہر پھینک دیا۔ اس بھبھوکے کے پیچھے بھاگنے لگا اور پھر اس دھوئیں کے غبار سے ساحرہ دلہن بن کر نمودار ہوئی۔ ہاں اسے اچھی طرح یاد ہے۔ ساحرہ جب دلہن بن کر آئی اور رات کو اس کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ۹ سال بعد ساحرہ کا جسم دیکھ کر وہ حیران سا ہو گیا تھا وہ اچھی خاصی عورت بن گئی تھی، گھونگھٹ

نکلے وہ گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ اس نے گھونگھٹ اٹھایا۔ ساحرہ کو دیکھ کر اس کے ذوق حسن کو تسکین ہوئی۔ وہ حسین تھی اور وہ بھی جوان۔ جوانی بذات خود حسین ہوتی ہے اس کا دل مسرت سے دھڑکنے لگا اس نے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا۔ اور ساحرہ نے شرما کر منہ گھٹنوں میں دبا لیا۔ دونوں میں شدید محبت پیدا ہو گئی۔ دونوں خوش تھے اور اسی محبت اور خوشی میں ایک سال گذر گیا پھر ایک سال بعد اس نے محبت کی دنیا سے ذرا پرے ہٹ کر خالص شوہر کی نگاہوں سے ساحرہ کو پرکھا وہ جانتا تھا ازدواجی زندگی میں محبوبہ کے بجائے بیوی کی ضرورت ہے اور جب اس نے ساحرہ کو ازدواجی کسوٹی پر پرکھا تو اس کو مایوسی ہوئی۔ ساحرہ اچھی بیوی نہ تھی، اس نے سوچا وہ نہ تو زبیری کی بیوی شفو کی طرح غزلیں کہتی ہے اور نہ ہی اس کے افسانے سن کر داد دیتی ہے اس کو یاد ہے پہلی رات کو اس نے کتنی رومانی باتیں کی تھیں، تمام رات وہ بولتا رہا اور ساحرہ بغل میں لیٹی سنتی رہی اور جب اس نے ساحرہ کی طرف دیکھا اسے محسوس ہوا کہ وہ تمام رات خالی کمرے سے بکواس کرتا رہا ہے۔ ساحرہ تو سوتی رہی تھی اس نے ساحرہ کے متعلق کئی افسانے لکھے ساحرہ نے پڑھے مگر اس کو کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ اس نے کیا لکھا اور کیوں لکھا۔ اس کو سخت کوفت ہونے لگی اور پھر اس کو ربانی یاد آ گیا جو اپنی اہلیہ کی تعریف میں قصے سنایا کرتا تھا۔ کتنا بلند کردار بتایا تھا ربانی نے اپنی بیوی کا۔ اس نے سوچتے سوچتے سوتی ہوئی ساحرہ کی طرف دیکھا۔ ہاں یہ ساحرہ

جس کو نہ اس کی کتابوں سے دلچسپی تھی نہ اس کے افسانوں سے، جس کو نہ اس کے کپڑوں کا خیال تھا نہ روٹی کا وہ تو ایک مشین تھی سرد اور پتھر کی طرح جو خود نہیں چلتی بلکہ چلائی جاتی ہے۔ اس نے ایک سال اور نکال دیا وہ اس کو سمجھاتا رہا۔ مگر ساحرہ جیسی تھی ویسی ہی تھی، اس نے اس پر بگڑنا شروع کر دیا بولنا بند کر دیا ہفتوں خاموشی میں گذر جاتے۔ اور پھر ایک دن ساحرہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور وہ جھنجھلا جاتا۔ وہ آنسو نہیں چاہتا تھا۔ پیار چاہتا تھا۔ شدید اور برملا پیار وہ چاہتا تھا کہ ساحرہ پوچھے "پیارے رینو تم کیوں نہیں بولتے تمہیں کیا ہو گیا ہے" مگر وہ بجائے پوچھنے کے رونے لگتی اور وہ مایوس ہو کر ہمدرد بن جاتا وہ خود ہی اس کی کمزوریاں بتاتا وہ اس کو بتاتا کہ وہ کیا چاہتا ہے وہ وعدہ کرتی کہ آئندہ سے خیال رکھے گی اور وہ خوش ہو جاتا ایک ہفتہ بالکل درست گذرتا ساحرہ مستعدی سے اپنے وعدہ کو نبھانے کی سعی کرتی مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی پہلی روش پر آجاتی وہ ہی بے نیازی۔ وہی لاپرواہی۔ اور اس پر پھر سوچنے کا دورہ پڑ جاتا۔ اس کی آنکھیں ساحرہ کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتی تھیں اس کے چہرے پر مسرت دیکھنے کی خواہشمند تھیں مگر ساحرہ کا چہرہ جامد تھا۔ پرسکوت۔ سرد تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑی رہتی تھیں جیسے غصے سے بھری ہوئی لڑکی کی پیشانی اور پھر اس نے اکتا کر ساحرہ کو میکے بھیجدیا اس امید میں کہ شائد کچھ دن دور رہ کر وہ اس کی محبت کو زندہ کر سکے، اس نے خطوں میں وہ باتیں لکھ ڈالیں جو وہ زبانی نہیں

کہہ سکتا تھا۔ اور ساحرہ کا جواب آیا کہ وہ اس کے خط پڑھ کر دو دو دن تک روتی رہی ہے اور وہ بھنا کر خط پھاڑ دیتا۔

"روتی رہی ہے" وہ بڑبڑایا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک ساحرہ اس کی راہ پر نہیں چلے گی وہ اس کو نہیں بلائے گا۔ ایک مہینہ گزر گیا اس کو راتوں کی تنہائیاں چبھنے لگیں۔ وہ بال روم میں گیا رات فرنگی چھوکریوں سے ڈانس کیا۔ پکنک جاتا۔ کلبوں کے دروازے توڑتا رہا۔ اس نے انتہائی کوشش کی کہ وہ ساحرہ کی غیر موجودگی کو محسوس نہ کرے وہ بھلاتا رہا مگر ساحرہ اس کے دماغ سے نہ نکل سکی۔ اور پھر ایک دن اس نے ساحرہ کو بلا لیا وہ جب آئی تو اس کی محبت میں جوش تھا شدت تھی۔ وہ خوش تھا کہ وہ بدل گئی ایک مہینہ تک اس کے اور ساحرہ کے چہرے پر مسرت ناچتی رہی۔ مگر ایک ماہ بعد ساحرہ کی محبت پھر سرد ہونی شروع ہو گئی اور آہستہ آہستہ وہ پھر اسی ڈھلوان پر آ گئی۔ وہی جمود وہی لاپرواہی۔ وہ جب باہر سے گھر پہنچتا تو اس کو امید ہوتی کہ ساحرہ کو منتظر پائے گا اور وہ مسکرا کر اس کو گلے لگا لیگا۔ وہ اپنے کمرے میں قدم رکھتا ننھی اس کو دیکھ کر دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں جاتی "امی ڈیڈی آئے ہیں" ننھی ساحرہ کو کہتی اور ساحرہ گھنٹوں بعد اس کے پاس آتی جیسے اس کے آنے اور نہ آنے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ اس کی امیدوں پر اوس پڑ جاتی۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹ جاتا، رات بھر وہ انتظار کرتا کہ ساحرہ شائد اس سے پیار بھری باتوں کا آغاز کرے گی۔ مگر اس کا دماغ انتظار ہی انتظار میں

سُن ہوجاتا جب وہ صبح اٹھتا تو بھنایا ہوا ہوتا۔"

"رات آپ کو کیا ہوگیا تھا" ساحرہ پوچھتی۔

"تمہارا سر ہوگیا تھا" وہ جل کر جواب دیتا اور ساحرہ اس کا منھ تکنے لگتی۔

اور پھر ایک دن ساحرہ کا بھائی آگیا، اس نے اس کو اپنے کمرے ہی میں ٹھہرایا وہ اس کے بچپن کا دوست تھا۔ وہ تین چار دن رہا اور وہ اس کو دانستہ گھر دیر سے لے جاتا اور جب وہ گھر پہنچتا ساحرہ کو منتظر پاتا وہ اٹھ کر کھانا گرم کرتی اور وہ کہتا کہ "ہم کھانا کھا کر آئے ہیں" "تھوڑا اور کھا لیجئے" وہ اپنے بھائی کو مخاطب کرتی اور وہ جل کر کوئلہ ہو جاتا اتنا عرصہ ہوا شادی کو کمبخت نے ایک دن بھی تو نہیں پوچھا کہ کھانا کھاؤ گے یا نہیں" اور آج بھائی کی ڈو ڈو بجے تک منتظر رہتی ہے" وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا۔ اس کا دل چاہا کہ ساحرہ کا منھ نوچ ڈالے۔

آہستہ آہستہ وہ گھر بھر میں سنجیدہ ہو گیا، اس کے قہقہے۔ اس کی مذاق پسند طبیعت سب کچھ بدل گیا۔ اس کے دل کے شعلے سرد پڑ گئے، سارے گھر میں جمود طاری ہو گیا۔ ادھر آٹھ دن سے وہ ساحرہ سے نہیں بولا۔ صبح ساحرہ کو اس نے پرچہ لکھ کر دیا۔

تسلیم۔

ساحرہ۔

زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لئے دونوں پہیوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ ورنہ یہ گاڑی کچھ دور جا کر پستی کے غار میں گر

چاہتی ہے۔ میں نے اپنی چھ سالہ زندگی میں انتہائی کوشش کی ہے کہ تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر چلوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی کے لبوں پر افسردگی کی دھول جم گئی ہے اور میں اس دھول کو جتنا صاف کرتا ہوں اس پر اور ایک موٹی تہہ چڑھ جاتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ مجرم تم ہو۔ ممکن ہے کہ غلطی میری ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے جو خواب اپنی زندگی کے متعلق دیکھے ہیں بہت وسیع ہوں۔ ممکن ہے جو میں چاہتا ہوں وہ تمہاری پہنچ سے بہت زیادہ ہو ــــــ لیکن ساحرہ وہ خواب ناممکن العمل نہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم جو فطرت لے کر جوان ہوئی ہو وہ تمہاری اپنی نہیں ہے بلکہ تمہارے والدین اور گھریلو ماحول نے تمہیں ایسا بنا دیا ہے یہ تمہاری فطرت نہیں ہے یہ فطرت تمہیں دی گئی ہے میں نے خود کو بدلا اپنی فطرت کو تبدیل کیا تاکہ خود کو تمہارے ساتھ زیادہ وابستہ کر سکوں۔ مگر تم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹیں۔ تم وہاں ہی ہو جہاں شروع سے تھیں تمہاری یہ مستقل مزاجی قابل تعریف ہے مگر میرے لئے نہیں ــــــ باقی رہا یہ سوال کہ تم مجھ سے محبت بھی کرتی ہو یا نہیں تو مجھے اس کا یقین ہے کہ میرے سوائے تمہاری دنیا میں اور کوئی نہیں لیکن تمہاری یہ محبت تمہارا یہ خلوص کتنا سرد اور

یخ بستہ ہے۔ میں نے تمہاری اس سرد محبت کو اپنی گرم آہوں
سے ہوا دی مگر اب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمہاری چنگاری ماحول
کی منوں راکھ تلے دبی ہوئی ہے۔ جس کو پھونکنا میرے بس
میں نہیں۔ لہذا آج سے ساحرہ تمہارا اور میرا راستہ الگ
ہوگا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں تمہاری راہ سے ہٹ
جاتا ہوں ——— اب مزید تاخیر ہماری گتھیوں میں زیادہ
بل ڈالدے گی! والسلام

تمہارا رینو

ساحرہ نے پڑھا اور آنسوؤں کے دھارے پھوٹ نکلے، اس نے وعدے کئے
ہاتھ جوڑے اور رینو نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ ساحرہ
اس کے آخری وار سے بچنے کے لئے اپنی راہ بدل لے گی اور اسی امید میں وہ آج مسرت
سے پھولا ہوا گھر پہنچا کہ آج ساحرہ منتظر ہوگی مگر اسکو سوچنے کا وہی دورہ پڑ گیا
جب اس نے دیکھا ساحرہ اسی بے التفاتی سے میٹھی نیند سو رہی ہے، وہی
جمود، وہی تصوّر۔ اس کے دماغ میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔ کیا کبھی اسکی زندگی
میں بھی گرمائی جیسی گرمجوشی آئیگی کیا کبھی وہ زبیری اور ربانی کی طرح زندگی میں جنت
دیکھ سکے گا۔ اگر وہ غزلیں نہیں کہتی نہ کہے اس کے افسانے تو سمجھے اس نے
سگریٹ سلگایا۔ رات گذرتی رہی۔ ساحرہ سوتی رہی اور وہ کھڑکی سے کھلے
آسمان کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا ——— "

مرمر کا بُت

وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ مگر نیند جو آج اس کے خلاف بغاوت کر چکی تھی اس کے قریب تک نہیں آرہی تھی تصورات کے سیاہ بادل اس کو ادھر ادھر گھما کر پھر ایک مرکز پر لا کر پھینکدیتے اور اس کی اونگھتی ہوئی آنکھیں پھر رات کی سیاہ تاریکی میں جھانکنے لگتیں۔ وہ پہلو بدل کر تصور کے اس جال کو توڑنے لگتا۔ گذشتہ چند دنوں سے سلو کی یاد رات کی سیاہ تاریکیوں میں بری طرح ابھرنے لگی تھی جب بھی وہ بستر پر دراز ہوتا تو اس کا لاشعور جاگ اٹھتا اور سلو کے ہزاروں چہرے اس کو چاروں سے گھیر لیتے۔ اس کے سینے سے گہرا دھواں اٹھتا اور دماغ پر چھا جاتا۔ وہ انتہائی کوشش کرتا کہ سلو کی یاد کو دبا دے مگر اس کی کوشش روز افزوں سلو کے چہروں میں اضافہ کرتی رہی اور آج تو وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں بیسیوں لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔ کئی لڑکیوں سے اس نے عشق کیا تھا۔ کتنی ہی لڑکیوں نے اس کی بے وفائی سے تنگ آکر خودکشی کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اور سلو جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا صرف سنا کرتا تھا کہ اس کی منگنی سلو سے ہو چکی ہے۔ اور کئی دفعہ

وہ اس بوسیدہ رواج کے خلاف بغاوت کر چکا تھا، "میں بن دیکھے کسی لڑکی سے شادی نہیں کرونگا" وہ اپنی امی سے لڑائی کرتا۔

"ہائے بیٹا ایسا نہ کہو تمہارے ابا نے بڑے چاؤ سے اس کو بہو بنایا ہے" اس کی امی دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیتی "ہونہہ" وہ ناک چڑھاتا، "یہ بھی کوئی بات ہے کہ ابا جان نے اس کو میرے لئے منتخب کر لیا زندگی تو میں نے بِتانی ہے اس سے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ اور آپ اس پرانے رواج کی لاش کو اب تک گھسیٹتے ہوئے چلے آتے ہیں" ہر چوتھے پانچویں وہ اسی بحث کو نئے سرے سے شروع کرتا مگر امی ہمیشہ اس کو خاندانی وقار کا واسطہ دے کر چپ کرا دیتیں۔ اور ایک دن تو اس نے میری سے بال روم میں ڈانس کرتے کرتے سِول میرج کا وعدہ کر لیا۔ مگر اس کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میری اسٹیورٹ ہیٹ سے ہے اور اس کی بغاوت بالکل سرد پڑ گئی۔

وہ بالکل دبلا پتلا تھا ایسے جیسے سرو کا ٹانڈا جیسے بند چھتری لیکن پھر بھی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں اس کے دوست اس سے لڑکیوں کے پھلسنے کے گُر پوچھتے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی اس میں کوئی ایسی بات ہے جس سے لڑکیاں اس کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں اور ان لڑکیوں کی بہتات نے اس کو ندیدہ بنا دیا تھا۔ بلا خور بچے کی طرح وہ کبھی بھی سیر نہیں ہوتا تھا اس کی بھوک اس کے دماغ میں گھس کر ہڑبونگ مچا دیا کرتی

تھی۔ اور وہ فوراً لڑکیاں بدلنا شروع کر دیتا۔ ایک لڑکی کے ساتھ وہ زیادہ عرصہ رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بہت جلد اس کو محسوس ہونے لگتا کہ پہلی لڑکی اب پرانی ہو چکی ہے۔ اور وہ فوراً ڈلیزی کی لڑکی چھوڑ رستم جی کی لڑکی کے ساتھ ہو لیتا اور پھر شاہدہ اور نرملا کو اپنا لیتا وہ اسی طرح لڑکیاں بدلا کرتا۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اس کی چھوڑی ہوئی لڑکیاں اس کی کبھی برائی نہیں کرتی تھیں، یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ وہ عیاش تھا۔ نہیں۔ اس کو جنسی معاملات سے لگاؤ نہیں تھا وہ رات کے گئے اندھیرے میں لڑکیوں کے ساتھ بند کمروں میں پڑا رہتا مگر جنسی ہوس اس کو کبھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں اس کو بری طرح چاہتی تھیں، وہ ان میں پیاس کا شدید احساس پیدا کر کے ان کو تشنہ ہی چھوڑ دیتا اور پھر وہ اپنے لبوں کو زبان پر پھیر پھیر کر اپنی اس تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کئی لڑکیوں کو اس سے نفرت بھی تھی، وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں کو کہتیں کہ وہ تو بیہودہ ہے بزدل ہے، ظالم ہے۔ بدتمیز ہے، ہرجائی ہے۔ اور وہ خاموش رہتا۔ یہ لڑکیاں اس کی زندگی میں ایسے داخل ہو چکی تھیں جیسے زندہ رگوں میں لہو۔ اور پھر ایک دن اس کی شادی ان جانی سلو سے ہو گئی اور اس کا لہو رگوں میں جم گیا، اس کے بعد نہ جانے اس کو کیا ہو گیا۔ جیسے اس کی بھوک کو تسکین مل گئی ہو۔ وہ سلو کو بری طرح چاہنے لگا۔ دوسری تمام لڑکیوں کو اس نے پرے پھینک دیا تھا لیکن جلد ہی اس کو سلو کو چھوڑ کر

یہاں آنا پڑ گیا۔ اس کی جدائی کو وہ بری طرح محسوس کر رہا تھا، لبستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ سلو کے ہزاروں مسکراتے ہوئے چہرے اس کو بلا رہے تھے اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر تکئے میں جذب ہو رہے تھے۔ بارہ بج چکے تھے۔ یکایک وہ لبستر سے اٹھا کپڑے بدلے اور باہر لمبی سلیٹی رنگ کی سنسان سڑک پر اس طرح چلنے لگا جیسے کوئی دیوانہ بلا مقصد کسی طرف چلا جا رہا ہو۔ اور پھر چلتے چلتے وہ تار کے کھمبے کے نیچے کھڑا ہو گیا، سگریٹ کا دھواں اگلنے لگا۔

"چلئے گا بابو جی" وہ چونکا سامنے ایک تانگہ کھڑا تھا وہ غیر ارادی طور پر تانگہ پر چڑھ گیا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو چابک دیا اور ماہیا گانے لگا، سنسان فضا میں تانگے والے کی آواز گھوڑے کی ٹاپوں سے ملکر کچھ عجیب قسم کا راگ بنگئی تھی کافی دیر بعد تانگہ ایک گلی میں جا رکا۔

"اوپر چلے جائیے" تانگے والے نے مسکرا کر کہا اور اس نے پانچ کا نوٹ کوچوان کو بڑھا دیا، بالاخانے پر پہنچا تو آنکھیں چندھیاں گئیں۔ کمرہ سجا ہوا تھا چاندنی بچھی ہوئی تھی۔

"تشریف لائیے" زہرہ کی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند کر دیا گیا، سازندوں نے ساز سنبھالے اور زہرہ نے توڑہ لیا۔ اس کا نیم عریاں جسم طبلے کی تھاپ پر تھرک رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی حسین آنکھیں اپنے گاہک پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ

ساکت تھا اس پر جمود طاری تھا۔ زہرہ کی آنکھوں میں اس کو سلو کی نگاہیں نظر آ رہی تھیں زہرہ کے سینے میں سلو چھپی بیٹھی تھی اس کو نہیں معلوم رقص کس وقت ختم ہوا۔ سازندوں ساز بند کر دیئے گئے، مگر اس کے منہ سے ایک کلمۂ داد بھی نہ نکلا۔ زہرہ حیران نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"پسند آیا آپ کو"۔ آخر زہرہ نے خود ہی پوچھ لیا۔

"پسند!" ہاں پسند نام ہے زندگی کی حرارت کا مجھے بھلا کیا پسند آئے گا یہ رقص جس کی رگوں میں لہو جم چکا ہے"۔ اس نے کہا اور زہرہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہے زہرہ کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا اس کا رقص بلا واہ واہ کیسے ختم ہو جائے بلا داد لئے لوٹ جائے آج وہ اپنے رقص کی توہین کروا رہی تھی آج اس کا فن ایک بیوقوف نوجوان نے رسوا کر دیا تھا وہ طوائف تھی۔ مگر اس کے طوائفی لبادے میں ایک عورت بھی چھپی ہوئی تھی۔ آج اس سوئی ہوئی عورت کو اس نے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ آج تک زہرہ کے کانوں نے داد کی آوازیں سنی تھیں، بڑے بڑے نوابوں نے اس کی تعریف کے پل باندھے تھے اور آج اس اجنبی نے اس کا رقص تک پسند نہیں کیا تھا وہ رقص جس نے بڑے بڑے مدبروں کے سرد احساسات کو جھٹکا دیا تھا۔ وہ رقص جس نے فنکاروں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ آج اس کا رقص طفلانہ حرکت بن کر رہ گیا۔

" اس نے سو کا نوٹ بڑھایا

"معاف کیجئے میں اس مال کی قیمت نہیں لیتی۔ جو مال گاہک ناپسند کرے"۔ زہرہ نے نوٹ حقارت سے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو یہ مال اُس وقت خرید لیا تھا جب آپ نے دروازہ بند کروادیا تھا۔ میں مال خرید کر واپس نہیں کرتا خواہ وہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو" اس نے اصرار کیا مگر زہرہ نے نوٹ نہ لیا۔

"میں یہ قیمت اس وقت لوں گی جب آپ کی رگوں میں جما ہوا لہو دوڑنے لگے گا جب آپ کی روح کا یہ جمود میرے رقص کے مسلسل توڑوں سے ٹوٹ جائے گا۔ جب آپ میرا رقص ختم ہونے پر چونک جائیں گے ایسے جیسے کسی حسین خواب سے جگا دیا جائے" زہرہ نے کہا اور وہ اٹھ کر چلا آیا زہرہ طوائف نے آج اپنا چولا بدل کر نیا روپ دھار لیا تھا، اس کے اندر چھپی ہوئی عورت بری طرح تڑپ اٹھی تھی۔ اس بری طرح کہ اس نے سارنگی کے تار نوچ ڈالے، طبلے کا چمڑہ پھاڑ ڈالا۔ وہ ایک مکمل عورت بن گئی تھی اور اس کا خالق جا چکا تھا۔ زہرہ کی زندگی میں ایک شگاف ڈال کر زہرہ کی طوائف کو اس سے سخت نفرت ہو گئی تھی وہ چاہتی تھی کہ اس کا منہ نوچ ڈالے مگر زہرہ کی عورت کو ایک عجیب احساس پیدا ہو چکا تھا جس میں نہ محبت تھی نہ نفرت مگر ایک ہمدردانہ جذبہ تھا ایک معصومانہ تمکنت تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے طوائف کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ داد نہ دے کر ایک موٹی گالی تھوکی ہے۔

دوسرے دن زہرہ نے محفل جمانے سے انکار کر دیا، امی نے سمجھایا۔

استاد جی نے پڑھایا، دھمکیاں دیں مگر سب کو جلد محسوس ہونے لگا کہ زہرہ کی زندگی سے طوائف خارج ہو گئی ہے۔ زہرہ بھی حیران تھی کہ یکایک اس کو کیا ہو گیا ہے۔ چھ سالہ مسلسل محنت جو استاد جی نے طوائفی فنون کے متعلق دی تھی یکایک ڈھیر ہو گئی۔ وہ گر جو اس کو مردوں کو مات دینے کیلئے سکھائے گئے تھے سب بیکار ہو گئے وہ شکارن جو ہزاروں دلوں کا شکار کھیل کر مسکرایا کرتی تھی وہ خود شکار ہو بیٹھی۔

اور وہ ——— وہ گھر جا کر پھر بستر کی سلوٹوں پر لوٹنے لگا۔ صبح جب وہ اٹھا تو اس کا دماغ بھاری ہو چکا تھا وہ چاہتا تھا کہ گھر چلا جائے مگر پھر ابا جان کی غصہ سے بھری ہوئی آنکھیں دکھائی دینے لگتیں وہ بغیر ان کی اجازت لئے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کو اپنے ابا پر بھی غصہ آنے لگا وہ کاش وہ کبھی شادی نہ کرتا سلو اس کے دماغ پر کبھی سوار نہ ہوتی ؛؛ وہ سلو جس کے خلاف اس نے کئی بار بغاوت کی تھی، دن گذر گیا مگر سلو کی گہری یاد اس کے دماغ میں سرسراتی رہی۔ اور جب رات ہوئی تو وہی چہرے، وہی تڑپ وہی دکھ، وہ کسی طرح بھی بھلانا چاہتا تھا کسی قیمت پر سلو کو اپنے اعصاب سے اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ وہ پھر گذشتہ رات کی طرح سیٹی بنگ کی سڑک پر چلنے لگا۔ شاید وہ کسی طرح سلو کو بھلا سکے۔ کسی مشغلے میں اس کو تحلیل کر سکے وہ چلا جا رہا تھا وہ چونک سا گیا سامنے بلڈنگ سے بینڈ کی آواز آ رہی تھی۔ بہت دنوں بعد اس نے مغربی موسیقی کی آواز سنی تھی اس کے قدم بڑھے اور جب وہ اوپر پہنچا تو بال روم میں امریکن

بھرے ہوئے تھے اینگلو انڈین اور پارسی لڑکیاں چھا رہی تھیں میبل سجے ہوئے سندلی رنگ کی شراب گلاسوں میں لہریں لے رہی تھی، رقص ہو رہا تھا مگر اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور پاس ہی پڑے ہوئے ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ابھی سستایا بھی نہ تھا کہ ایک ایرانی لڑکی آ پہنچی۔

"معاف کیجئے گا یہ ٹیبل انگیج ہے" ایرانی لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

آئی۔ ایم۔ سوری" اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اور پھر نہ جانے ایرانی لڑکی کو کیا یاد آیا۔

"آپ بیٹھ جائیے" اس نے کہا

"مگر آپ کا ساتھی" وہ بولا

"کوئی بات نہیں وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا" ایرانی لڑکی نے جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا۔

"رمبا" شروع ہوا۔

"آپ رقص کیجئے گا" وہ بولا اور ایرانی لڑکی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی بینڈ کی دھنوں پر اس کے پاؤں ناچنے لگے۔ وہ نغموں پر پرواز کرنے لگا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھا رہا تھا "رمبا" کی شدید دھنیں اس کے روئیں روئیں میں تحلیل ہو رہی تھیں، جب بینڈ ختم ہوا تو وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ لڑکی کی سانس بھی پھول چکی تھی۔

"آپ بہت اچھا ناچتے ہیں . . . . میں . . . . . . میں نے

زندگی میں پہلی بار انڈین سے ڈالنس کیا ہے اور مجھے محسوس ہوا ہے کہ یہ امریکن ناچنا نہیں جانتے کمبخت پاؤں پر پاؤں چڑھا دیتے ہیں" لڑکی ایک ہی سانس میں کہہ گئی، دوسرے لمحے وہ امریکن ساتھی کو خیرباد کہہ چکی تھی، شراب کے نشے میں مدہوش وہ اس سے لپٹی جا رہی تھی۔

"تم بہت پیارے ہو یہ امریکن تو لڑکیوں کی روح تک کو نچوڑ ڈالتے ہیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کے شدید بوسے تمہاری آغوش کی گرمی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آؤ ڈارلنگ باہر کھلی ہوا میں چلیں" اور وہ اس کو لے کر باہر نکل گئی اس کی باہیں اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھیں، اس کا گداز جسم اس کے جسم میں دھنسا جا رہا تھا اور وہ اس کو جھاڑ کے پاس لے جا کر بری طرح لپٹ گئی۔ اور یکایک اس کا جسم تھرتھرانے لگا۔ فضا میں سلو رقص کرنے لگی اس کی یاد اس شدت سے اُبھر آئی کہ اس کی کنپٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے ایرانی چھوکری کو دھکا دیکر پرے دھکیل دیا۔ اور بے تحاشا بھاگا اس کو ایسا محسوس ہوا کہ ایرانی چھوکری اس کی شہ رگ کو پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ "لفنگی" وہ بڑبڑایا اور گھر جا کر بستر میں دھنس گیا، نیند کو رشوت دینے کی انتہائی کوشش کی مگر سلو کی یاد دل میں مسلسل کسمساتی رہی۔ اور وہ کروٹیں بدلتا رہا۔

دن گذرتے رہے۔ مگر وہ سلو کی یاد کو کسی طرح بھی اتار کر نہ پھینک سکا، کاروبار پکنک، بال روم کلب وہ جہاں بھی جاتا سلو اس کے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی، راتیں آتیں اور اس کا تکیہ گرم آنسوؤں سے نم ہو جاتا۔

اور پھر ایک دن خاموش فضاؤں میں زلزلہ آ گیا۔ اُفق کی تلچھٹ چھٹ گئی، آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیاں دوڑنے لگیں۔ وہ زہرہ کے مکان پر پہنچا۔ اوپر جانے لگا تو استاد جی نے روک دیا۔

"بائی جی نے منع کر دیا ہے" استاد جی نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

"منع کر دیا ہے —— کس کو" اس نے پوچھا۔

"سب کو"

"جاؤ اوپر جا کر کہو کہ اجنبی آیا ہے" مگر بیشتر اس کے کہ استاد جی اوپر جاتے زہرہ نے بالاخانہ سے دیکھ لیا۔

"ان کو اوپر لے آؤ استاد جی" زہرہ بولی اور استاد جی کھسیانے ہو گئے۔

وہ اوپر چڑھ گیا۔

"سنا ہے آپ نے رقص و سرود کی محفل بند کر دی" اس نے چاندنی پر بیٹھ کر کہا۔

"ہاں" زہرہ بولی۔

"وہ کیوں"

"بیمار تھی —— مگر آج گاؤں گی" وہ مسکرائی۔

"یعنی"

"مسیحا جو آ گیا" اور پھر سازندوں نے ساز چھیڑے اور زہرہ نے غزل شروع کی۔

"اچھے مسیحا ہو مریضوں کا حال اچھا ہے"

وہ گا رہی تھی مسلسل اور بے تکان آج وہ موسیقی کی آخری منزلوں پر پرواز کر رہی تھی اس کے گلے سے نکلی ہوئی آواز آسمان کی گہرائیوں میں گونج رہی تھی۔ باہر چلتے ہوئے راہ گیروں کے پاؤں رک گئے تھے افق پر منڈلاتی ہوئی ابابیلوں کے نغمے خاموش ہو گئے تھے۔ فضا ساکت تھی۔ در و دیوار چپ تھے مکان کے نیچے پان والے کے ہاتھ پان بناتے بناتے بہک رہے تھے۔ پاس والیاں حیران تھیں معلوم ہوتا تھا کہ آج زہرہ زندگی بھر کا ترنم نچوڑ کر رکھدی گی۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ مریض کا حال اچھا ہے

وہ بار بار مصرعہ دوہرا رہی تھی۔ اور وہ ——— وہ جھوم رہا تھا، اسکی آنکھیں مسکرا رہی تھیں جب زہرہ نے گانا بند کیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"بہت خوب کیا گلا پایا ہے آپ نے" اس نے تعریف کی مگر خلاف توقع زہرہ خاموش تھی اس کی داد کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا، زہرہ کی نظریں اس کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں اس کی آنکھوں سے دل میں تلملاتے ہوئے درد کا اظہار ہو رہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہہ نکلے مگر اس نے جلدی سے چھپا لئے۔

"آپ افسردہ ہیں" وہ بولا

"ایسا بھی کبھی ہوتا ہے اجنبی"، زہرہ نے آہستہ سے کہا اور اس کے

قریب آ بیٹھی۔ اس نے سو سو کے پانچ نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ زہرہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"آج تو آپ کا فن مجھے پسند آگیا آج تو آپ کو اس کی قیمت لینی ہی پڑیگی۔"

وہ بولا۔

"نہیں ——— آج میں نے اپنے فن کو بیچنے کے لئے نہیں گایا۔ آج میں نے اپنی دوکان سے اپنے لئے چیز پسند کی تھی۔"

"مگر آپ نے گانا تو میرے کہنے پر گایا،" وہ جھنجلایا۔ وہ ایک طوائف سے شکست کھانا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں اجنبی تمہارے کہنے پر نہیں تمہارے آنے پر گایا ہے۔ آج میں نے تمہارے اس سنگ مرمر کے طرح سخت بُت میں روح پھونکنے کے لئے گایا ہے۔ آج میں نے اپنی روح کی چیخوں کو تمہارے دماغ تک پہنچانے کے لئے گایا ہے۔ آج میں نے بہت بڑا سودا کرنے کے لئے گایا ہے۔"

زہرہ کہہ رہی تھی اور وہ حیرانی سے سُن رہا تھا۔

"بہت بڑا سودا؟"

"ہاں اجنبی بہت بڑا سودا۔ آج میں نے تم سے قیمت وصول کرنی ہے۔ یہ جسم ہزار جگہ بک چکا ہے ہزاروں روپیوں کے عوض مگر اجنبی یہ دل اسی طرح پاک ہے سیپ سے نکلا ہوا موتی۔ یہ ابھی کہیں نہیں بکا آج میں اس کا سودا کروں گی کیا اتنی رقم ہے تمہارے پاس کیا تم اس کو خرید لوگے۔"

زہرہ نے اس کے زانوؤں پر سر رکھدیا۔

"زہرہ تم بھٹک گئی ہو ـــ تم نے بھول کی ہے۔ بکا ہوا سودا نہیں بیچا جاتا۔ میرا دل بک چکا ہے۔ بہت دنوں سے۔ آج میں اس لئے خوش نہیں تھا کہ تمہارے گانے نے میرے لہو کو گرما دیا۔ نہیں زہرہ تم نے غلط سمجھا آج میں خوش ہوں۔ مسرور ہوں۔ اسلئے کہ میرے خریدار نے مجھے بلایا ہے میرے ابا نے اجازت دیدی ہے۔ مجھے میری سلو نے بلایا ہے، اس نے جس نے میری روح پر جمود طاری کر دیا تھا اس نے جس نے بقول تمہارے مجھے پتھر کا بت بنا دیا تھا" وہ اٹھا اور بے دھڑک سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چلا گیا چاندنی پر سو سو کے پانچ نوٹ پڑے ہوئے تھے اور زہرہ کے اندر جاگی ہوئی عورت نے ایک آخری ہچکی لی!"

سرد شعلے

مجھے یاد ہے دسمبر کی وہ سرد رات۔ جب سردی اپنے عروج پر تھی اور بالخصوص اس رات ہوا کی خنکی جسم کے مساموں میں دھنسی جا رہی تھی۔ وہ سرد اور حسین رات میری زندگی میں ایک نیا باب لے کر آئی تھی۔

سردی سے انسیت مجھے ورثہ میں ملی ہے اس لئے موسم سرما میرے لئے موسم بہار بن کر آیا۔ اور دل و دماغ کو حسین خوابوں سے معطر کر دیا ——— پاس ہی کشمیر کی چمکدار پہاڑیوں سے جب ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی آتی تو میرے کان اور ناک سرخ ہو جاتے۔ اس سرخی کو آئینہ میں دیکھ کر عموماً مسکرا دیا کرتا۔ ہاں تو دسمبر کی وہ خنک رات! ———

——— میں اپنے نرم بستر میں دھنسا ہوا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ مگر باہر ہوا کا شور پھر بھی سنائی دے رہا تھا۔ ور میں بالکل مخمور ہو چکا تھا۔ یکایک گھنٹی بجی اور میرے دماغ پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔ غصہ سے یقیناً میرا چہرہ سرخ ہو گیا ہوگا۔؟

"کیا ہے" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"کوئی صاحب بلانے آئے ہیں آپ کو" نرس نے گھبراہٹ سے جواب دیا ——— میں تلملا یا گیا۔ دل میں بڑبڑایا اٹھا۔ . . . . . . "اسی وقت مرنا تھا کمبخت کو نہ جانے سرد راتوں کو ہر مریض اتنے بدتمیز کیوں ہو جاتے ہیں۔ سوچا انکار

کردوں - پھر خیال آیا ڈاکٹر ہوں اور پرنسپل نے مجھے خاص طور پر ہدایت دی تھی اپنی خوشی کے لئے کسی کی جان سے کھیلنا اخلاقی جرم ہے۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا گھنٹی دوبارہ بجی اور میں نے غیر شعوری طور پر اپنے لحاف کو پرے پھینک دیا تھا اور کوٹ پہنا اپنے آپ کو اچھی طرح محفوظ کرنے کے بعد دروازہ کھولا باہر گیا تو ایک نوجوان کو منتظر پایا۔

"جلدی چلئے ڈاکٹر صاحب"

نوجوان نے میرا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا ——— اور میں بغیر جواب دیئے ان کی کار پر سوار ہو گیا۔ کار میں بیٹھ کر مجھے کوفت سی ہوئی کیونکہ یہ لوگ کافی امیر معلوم ہوتے تھے اور میں روپیوں سے زیادہ دعائیں لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں مجھے روپوں کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال قہر درویش بر جان درویش۔

کار ایک بنگلے میں جا کر رکی۔ میں نوجوان کے پیچھے ہو لیا، دو کمرے طے کرنے کے بعد تیسرے کمرے میں پہنچا تو توقع کے عین مطابق کمرہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے چہروں پر گرد جمی ہوئی تھی، ایک کونے میں ایک عورت بیہوش پڑی تھی، اور اس کے ساتھ ایک مردرونی سی صورت بنائے بیٹھا تھا ——— میں نے انجکشن دیا اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں کھلنے لگیں۔

"ساحرہ!" پاس بیٹھے ہوئے نوجوان نے بیقرار ہو کر پکارا اور میں نے اس کو بات کرنے سے منع کر دیا۔

"گھبرائیں نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"شکریہ ڈاکٹر"۔ نوجوان نے جواب دیا اور پھر ساحرہ کی جانب دیکھنے لگا

تقریباً دس منٹ بعد وہ بالکل ہوش میں آگئی۔ مگر میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے بجائے تشکرانہ نظروں کے اس کی آنکھوں میں آنسو تھرتھراتے ہوئے دیکھے۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"مریضہ کو تنہائی کی ضرورت ہے"۔ میں نے کہا۔

تمام بیٹھی ہوئی عورتیں کھڑی ہوگئیں۔ مسرت اور اداسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اب کمرے میں صرف مریضہ اور جوان بیٹھا رہا۔

"آپ کا نام" میں نے نوجوان سے استفسار کیا۔

"جعفری۔ یہ میری اہلیہ ہیں"۔ جعفری نے ادھ موئی آواز سے جواب دیا۔

"کیا یہ عموماً بیہوش ہو جاتی ہیں۔ یا یہ پہلی بار ہے"۔

"جی اکثر بیٹھے بیٹھے: جانے کیوں" جعفری نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ——— اور میں نے ساحرہ کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور مجھے متوجہ دیکھتے ہی وہ کسمسائی ——— مجھے پہلی بار اس کے حسین ہونے کا خیال ہوا اور اس احساس کے ابھرتے ہی میں نے اس کو دبانے کی کوشش جاری کر دی۔ مگر ساحرہ کی وہ نظر بری طرح میرے دماغ میں ننگنے لگی۔

"جی میں کل پھر آ کر دیکھوں گا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ساحرہ نے چونک کر میری جانب دیکھا اور میرے لبوں کے زاوئیے پھیل گئے۔ جعفری نے فیس دی اور میں چلا آیا۔

گرچہ اس وقت میں قطعاً جوان تھا۔ مگر کسی بھی مریضہ کو میں اپنی جوانی کا بوجھ بنانے پر ہرگز آمادہ نہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اچھے اچھے گھرانے مجھ پر بھروسہ کرتے تھے اور اسی بھروسے کا لبادہ میری روح پر ہمیشہ چڑھا رہا۔ جس کو میں نے دانستہ طور پر کبھی اتار پھینکنے کی کوشش نہیں کی اور اسی بنا پر اکثر بلا روک معزز گھرانوں کے زنان خانوں میں داخل ہو جایا کرتا تھا۔

دوسرے دن صبح میں ساحرہ کے یہاں پہنچا، بنگلے کو بغور دیکھا کمروں کا مطالعہ کیا اور مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس گھر کے باشندے "ترقی پسند" ہیں اس وقت گھر میں سوائے ساحرہ کے اور اس کی بوڑھی ساس کے اور کوئی بھی موجود نہ تھا۔ ساحرہ میرے سامنے صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور میں کچھ کہنے کے لئے بیتاب تھا۔

"محترمہ گرچہ مجھے آپ کے خانگی معاملات پر کچھ پوچھنے کا حق حاصل نہیں لیکن کل رات آپ کے آنسو ضرور تفصیل طلب ہیں" میں نے بالآخر سکوت کو توڑا

"زندگی صرف مسکراہٹوں ہی کا نام نہیں ہے ڈاکٹر" ساحرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مجھے اعتراف ہے۔ مگر وہ آنسو آپ کی زندگی میں کیونکر داخل ہوئے

شاید میں یہی پوچھنا چاہتا تھا۔

"بعض اوقات انسان ریتلے میدان میں اپنا ایوانِ زندگی تعمیر کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی بنیادیں کھوکھلی ہیں۔" ساحرہ نے چھت کی جانب نظریں جما کر جواب دیا۔

"مگر آپ کے بشاش ماحول کو دیکھ کر کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ نے اپنی زندگی کی تعمیر غلط کی ہو۔ یہاں تو ہر طرف مسرتیں رقصاں نظر آتی ہیں۔" میں نے کریدنے کی کوشش کی۔

"ہاں! ڈاکٹر رات میں چاندنی میں لق و دق صحرا کو دیکھ کر اکثر قافلے پانی کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔" ساحرہ نے ایک لمبی آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"مگر محترمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"دیکھو ڈاکٹر میرا نام ساحرہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس نام سے نفرت نہیں ہو گی ـــــــ محترمہ ایک بہت پرانا لفظ ہے۔" ساحرہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"شاید میرا پیشہ مجھے اس کی اجازت نہ دے۔"

"مگر اس وقت آپ اپنی ڈسپنسری میں تو نہیں ہیں۔"

"مگر مریض کے پاس تو ضرور ہوں" میں مسکرایا۔

"مریض!" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ڈاکٹر تمہارا نام؟" اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"اعجاز"

"اعجاز! بہت خوب"، ساحرہ نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ اور میں کھڑا ہو گیا۔

"چل دیئے"

"جی . . . . . جی کام ہے"

"تو کل . . . ."

"پرسوں ضرور آؤں گا" میں نے کہا

"ضرور! ___ کہیں باہر چلیں گے"، ساحرہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بہتر! میں نے جواب دیا۔ اور چلا آیا۔

گھر پہنچ کر صوفہ پر آدھا لیٹ گیا اور سگریٹ کے دہوئیں میں کھو جانے کی ناکام کوشش کی، ساحرہ کی پر اسرار زندگی اور اس کی الجھی الجھی باتوں نے میرے دل ودماغ میں الجھن پیدا کر دی۔ یہ نامکمل عورت میری زندگی کی راہ میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی بھی کسی لڑکی کو اپنے اوپر فریفتہ ہونے کا احساس نہ کیا تھا۔ مگر اس روز مجھے محسوس ہوا کہ ساحرہ مجھ سے ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی۔

اس کا خاوند حسین ہے۔ خیالات بھی اچھے ہیں" میں سوچ رہا تھا، "پھر نامعلوم اس آزاد دماغ لڑکی کو کیا ہوا جا رہا ہے۔ اس کے آزاد دماغ نے آخر شادی بھی طویل غور کے بعد کی ہو گی"

میرے تخیل کی سطح پر ہلکے ہلکے بادل اڑنے لگے اور میں از سر نو ساحرہ کے

ماضی کو جھانکنے کی ناکام کوشش میں سو گیا ـــــ تیسرے دن میں حسب وعدہ ساحرہ کے ہاں پہنچا اور خلاف توقع جعفر بھی موجود تھا۔

"آداب بجا لاتا ہوں" میں نے مسکرا کر کہا۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب ساحرہ آپ کا شدت سے انتظار کر رہی تھی" جعفری نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اور ایک لمحے کے لئے ساحرہ مجھے معمہ نظر آنے لگی۔

"کیا ساحرہ میرے جذبات سے کھیلنا چاہتی ہے" میرے ضمیر نے پکارا۔

"شکریہ" میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ اور ایک نظر ساحرہ کی جانب دیکھا میری نظر بوکھلا گئی۔

یا اللہ یہ توبہ شکن حسن آج ساحرہ بقول شخصے "سولہ سنگار" کئے بیٹھی تھی کسی کمبخت کی شامت آئی تھی یا پھر مجھے تباہ کرنے کی مکمل تیاریاں تھیں ـــــ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اعجاز! ایک بیاہی ہوئی حسینہ آج تیرے لئے کچھ کر کے رہے گی۔ میں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"کہاں کا ارادہ ہے" جعفری نے ساحرہ سے پوچھا۔

"جہاں آپ لے چلیں" ساحرہ نے کہا اور میں ٹھٹک گیا۔

"بھئی مجھے تو معاف کرو" جعفری نے کہا اور میں سنبھل گیا۔

"مگر ساحرہ کا چہرہ اتر گیا اس کو دیکھ کر میرے تحت الشعور میں احساس کمتری کروٹیں لینے لگا۔

"آپ کو چلنا ہوگا ورنہ میں بھی نہیں جاؤں گی" ساجدہ نے متانت سے اصرار کیا۔

"مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہیں گے" جعفری نے برہم ہو کر کہا۔

"اعجاز!" ساحرہ نے مجھے مخاطب کیا۔

"جی" میں نے جواب دیا۔

"ہوا کتنی خنک ہے" وہ بولی۔

"جی کافی خنک ہے"

"اور خوفناک بھی میرا خیال ہے یہیں بیٹھا جائے۔

"مگر ساحرہ . . . . جعفری چلایا۔

"آگ کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے" ساحرہ نے جعفری کو سنے بغیر کہا۔

"ہاں بالخصوص اس وقت جب انسان کے دل و دماغ پر برف کی قلمیں جم جائیں"۔ جعفری بولا اور ساحرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں جعفری جب برف کی قاشیں انسان کی نیلی نیلی رگوں میں جما دی جائیں تو دہکتی ہوئی آگ اور بھی زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے"

جعفری نے سنا اور تلملا گیا مگر میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

میں "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کے مصداق بیوقوفوں کی طرح ان کا منھ تک رہا تھا۔ جعفری بغیر کچھ جواب دیئے چلا گیا۔ اور میری حیرانی میرے دماغ پر جم کر

رہ گئی۔

"اعجاز!" ساحرہ نے مخاطب کیا۔

"جی" میں چونکا۔

"سُن رہے ہو" ساحرہ نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا

"کیا؟" میں نے ماتھے پر لکیریں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"باہر ہوا کی یہ مایوس کن سیٹیاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور کہیں بیقرار لڑکی چیخ رہی ہے —— کتنی مہیب ہیں یہ آوازیں۔ اعجاز! زندگی کی آوازیں کبھی کتنی حسین ہوا کرتی تھیں۔ مگر . . . . "

وہ رُکی "مگر اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس زندگی کی لاش کو روند کر نکل گیا" ساحرہ کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے آنسو تھر تھرا رہے تھے جنہیں وہ روکنے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔

"ساحرہ" میں نے روندی ہوئی آواز میں کہا "خدا کے لئے اپنے راز مجھ سے نہ چھپاؤ کہدو جو کچھ کہنا چاہتی ہو ممکن ہے میں اس درد کا مداوا کر سکوں"

"اعجاز یہ سیٹیاں یہ آہیں —— یہ کسی کی مایوس کن چیخیں —— یہ مایوس روحیں اعجاز کبھی تم نے اس مادی دنیا کے لبادہ کو اتار کر دور آسمان کی وسعتوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں مایوس روحیں اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہیں۔ کبھی تم نے سوچا ہے یہ روحیں آخر مایوس کیوں ہیں اعجاز!" اور یکایک ساحرہ بلک بلک کر رونے لگی اور میں نے گھبرا کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"سنبھلو ساحرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم بھی جا رہی ہو"

"ہاں میں بھی جا رہی ہوں ـــــ میری زندگی بہک چکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تم ۔ ۔ ـــ ۔ ۔ تم نے اعجاز میری زندگی میں داخل ہو کر اس کو اور بھڑکا دیا ہے ۔ اف اعجاز میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہارے ساتھ ایک لمحہ بھی گذاروں ـــــ تنہا لمحہ ـــــ مگر جعفری بہت شاطر ہے اس نے دانستہ مجھے تمہارے ساتھ تنہا چھوڑ دیا بالکل اسی طرح جس طرح اس نے مجھے تمام عمر تنہا چھوڑے رکھا ہے"

ساحرہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اعجاز کتنا بے رحم ہے جعفری ۔ میں نے اس کو خود پسند کیا تھا ، ہم دونوں نے شادی سے پہلے محبت کی پینگیں بڑھائی تھیں اور یہ حسین اور چالاک مرد میرے ایوان حیات میں ہزاروں مسرتوں کے ساتھ داخل ہو گیا ۔

یکایک ساحرہ چونک اٹھی اپنے افشائے راز کے خوف سے ۔

"پھر کیا ہوا ساحرہ"

"کچھ نہیں اعجاز صرف وادیٔ نیل میں ایک دن طوفان آگیا" ساحرہ نے پھر شاعری چھیڑ دی ۔

"وہ طوفان کیوں اٹھا ۔ کیوں آیا" میں نے جلدی سے پوچھا ۔

"میں اب بھی جعفری کی دنیا میں آباد ہوں ۔ اسی طرح جس طرح وہ میری دنیا میں آباد تھا ۔ مگر میری دنیا تو اب ویران ہو چکی ہے"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا"

"ہاں تم نہیں سمجھے مرد عموماً نہیں سمجھتے اگر مرد عورت کو سمجھنے لگ جائیں تو دنیا میں کوئی عورت ویران نہ ہو" ساحرہ نے دور خلا میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر وہ طوفان" میں نے پھر پہلو بدلا۔

"وہ طوفان ——— وہ طوفان اس طرح اٹھا تھا۔ جس طرح میری دنیا میں محبت کی آندھیاں آئی تھیں۔ وہ آگ اب بھی سلگ رہی ہے۔ وہ شعلے اب بھی دہک رہے ہیں۔ مگر اس پر برف کی تہیں جما دی گئی ہیں، ٹھٹھری ہوئی اور یخ بستہ دل کی رگوں میں کبھی کبھی وہ شعلے بھڑکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر پھر برف کی پھوار پڑنے لگتی ہے ہوا کی یہ خنکی بڑھنے لگتی ہے اور . . . پھر یہ خوفناک سیٹیاں اُف اعجاز"

ساحرہ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور سر گھٹنوں میں دے کر دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ اور میں اپنے دماغ کی میخوں کو ٹھوکتا رہا۔

"پھر؟" ساحرہ کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"پھر . . . . پھر تم نے آکر اپنے ناخنوں سے اس برف کی سل کو کریدنا شروع کر دیا اور اب وہ چنگاری پھر سے بھڑک اٹھی ہے میں نہیں چاہتی کہ یہ آگ جو تم نے سلگائی ہے پھر سرد پڑ جائے ———

میں چاہتی ہوں کہ یہ مسرور لمحے جو تم نے مجھے دیئے ہیں میری کائنات پر چھا جائیں مستقل طور پر ——— یہ آرزو، یہ جستجو، میری زندگی کا ماحصل بن جائے مجھے یہ محسوس ہو کہ میں زندہ ہوں میری زندگی میں تموج ہے ——— حرکت ہے،

پسِ پردہ

وہ بالکونی میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ دھوپ کی تیز روشنی اس کے چہرے کو سرخ کئے دے رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوند جمی ہوئی تھی۔ مگر وہ وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا ــــ ان دو موٹی موٹی آنکھوں کا انتظار جو سامنے کے مکان میں پردے کے پیچھے سے اس کو روز پیام دیا کرتی تھیں ــــ دور ہی دور سے۔ گرچہ وہ اس دور افتادہ محبت کا قائل نہیں تھا ــــ بال روم اور پارک کی محبت اس سے بھی زیادہ گرم جوش تھی وہ اس گرم اور آتشین محبت کا عادی تھا۔ وہ موٹی موٹی آنکھیں جو اس پردے کے پیچھے سے جھانکا کرتی تھیں اتنی آتشین محسوس ہوئیں کہ بال روم کو بھول بیٹھا۔ بالکونی میں کرسی لگا کر ہاتھ میں کوئی کتاب اٹھا کر بیٹھ جاتا۔ اور پھر وہ آنکھیں آتیں۔ مسکراتیں اور پھر غائب ہو جاتیں ہر پانچ دس منٹ بعد وہ ان آنکھوں کو دیکھتا آج اس چشمک کا دسواں دن تھا اس کا آزاد دماغ اس "دوری" کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ بیٹھنا چھوڑ دے "لاحول ولا قوۃ" یہ بھی کیا محبت ہے۔ اچھی خاصی محبت، نہ ہاتھ سے اشارہ ہو سکتا ہے اور نہ منھ سے کوئی آواز۔ بس آنکھوں کو آنکھیں دیکھ سکتی ہیں" وہ سوچتا اور آج وہ تہیہ کر چکا تھا کہ اگر اس نے کوئی اشارہ یا ریسپانسی نہیں دی تو اس کا پیچھا چھوڑ کر ڈورتھی کو لے کر بیچ لگسرزی ہوٹل میں ڈانس کرنے چلا جائیگا۔

یا پھر حاجی کریم کے سنٹرل کیسنو میں جہاں اس کو ڈنر بھی کبھی کبھی مفت مل جاتا تھا ورنہ پندرہ روپیہ کا ڈنر اس کو محسوس ہوتا کہ حاجی کریم یہ ساری دولت جمع کر کے اپنے لئے سونے کا محل بنوائے گا تاکہ لوگ مرنے کے بعد قائد اعظم کے مزار کی بجائے وہاں جایا کریں۔ اس کی آنکھیں متواتر پردے پر رکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد پردہ ہلا آنکھوں نے جھانکا اور اس نے سلام کھینچ مارا اور آنکھیں پھر غائب —— وہ جھنجھلا گیا۔ "سیلی" وہ بڑبڑایا —— کمبخت دیکھتی ہے مگر کوئی سہارہ نہیں دیتی۔ آخر وڈکس کہیں کی،" وہ کو سنے دیتا اور کتاب پر نظریں جما دیتا۔ سگمنڈ فرائڈ کی تمام تھیوریز اسکو بری لگنے لگیں —— اور اس نے کتاب کو بند کر کے سگریٹ سلگایا ایک لمبا کش کھینچا دھواں اس کے سینے میں اٹک کر رہ گیا —— دو آنکھوں کے ساتھ مہندی لگا ہاتھ باہر نکلا اور ایک کاغذ کی گولی باہر گلی میں پھینک دی گئی —— اس نے نوکر کو آواز دی اور کہا کہ وہ گولی اٹھا کر لے آئے۔ نوکر گیا گولی لا کر حوالے کر دی اس نے جلدی جلدی کاغذ سیدھا کیا اور کھولا لکھا تھا۔

"کیوں بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو محلے والوں کو
پتہ لگ گیا تو؟

تمہاری

بانو

اس نے پڑھا اور مسرت سے وہ تمام دھواں جواب تک اٹکا ہوا تھا کچھ منھ اور کچھ ناک کے نتھنوں سے باہر پھینک دیا، اس نے اندر سے ایک کاغذ کا پرزہ

نکالا تھوڑا سینٹ چھڑکا۔ اور اس پر لکھا۔

تمہیں بدنامی کا خوف ہے۔ یہاں جان پر آبنی ہے
کب ملاقات ہوگی۔

تمہارا
بالکونی

خط تو لکھا مگر سوال تھا کہ بھیجا کس طرح جائے گا۔ کیونکہ گلی میں پھینکنے سے وہ تو منگانے سے رہی، وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اگر نوکر کو بلا کر دیتا ہے تو اپنی عزت کا خوف رہتا ہے۔ نوکر کو ہمراز بنانا اس کے نزدیک حماقت ہے، اس نے پردے کی طرف دیکھا اب آدھا چہرہ بھی دکھائی دے رہا تھا حسین اور گورا گورا چہرہ وہ دیکھ کر بری طرح بھڑک اٹھا، اب تک آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ مگر چہرے نے اس پر جادو کر دیا۔ اب تک یہ سلسلہ تفریح تھا مگر چہرہ دیکھنے کے بعد وہ اپنے اس بالکونی کے عشق پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا ـــــ اس نے چٹھی دکھائی اور مسکراتا ہوا آدھا چہرہ پردے کے پیچھے جا چھپا۔ وہ خود ہی اٹھا اور سامنے کی بلڈنگ کی طرف لپکا جب فلیٹ پر پہنچا تو دروازے کے چھوٹے سے جھرنے سے وہ ہی آنکھیں دکھائی دیں۔ وہ چٹھی پھینک کر بے تحاشہ نیچے اتر آیا۔ بعد میں افسوس ہوا کہ دروازہ کھلوا کر ذرا قریب سے باتیں ہی کی ہوتیں۔ مگر وہ پردہ دار لڑکیوں سے خوف کھاتا تھا ـــــ وہ آکر پھر بالکونی میں بیٹھ گیا۔ آنکھوں کا انتظار کیا مگر ایک گھنٹہ ہو چکا کوئی نہیں آیا ـــــ معلوم ہوتا تھا کہ خط سے غصہ آگیا ہے یا شرم ـــــ ان پردہ والیوں کو نہ جانے

محبت کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا، ساری عمر یوں ہی جھرکوں سے جھانک کر گذر جاتی ہے اور جب کسی سے عشق بھی کرتی ہیں تو اتنا بھونڈا کہ خوامخواہ مجنوں بننے کو دل چاہتا ہے۔ کہاں ڈورتھی کا آزادانا عشق کہاں زہرہ کا کھلے بندوں معاشقہ اور کہاں یہ بانو کا دم گھٹا دینے والا سلسلہ ـــــ کیا یہ عشق محض چٹھیوں تک ہی محدود رہے گا وہ سوچ رہا تھا اور پیچھے سے سجاد نے آکر چونکا دیا۔

"اماں سردی تو ابھی بہت دور ہے کیا بخار آگیا ہے" اس نے آتے ہی کہا۔

"بھئی نہیں بخار تو نہیں آیا البتہ عشق کا بخار ضرور چڑھ رہا ہے" اس نے جواب دیا۔

"خدا تمہاری حالت پر رحم کرے۔ آخر یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی" سجاد بولا۔

"کیا بتاؤں ـــــ سوچا کہ پرانے قسم کا عشق کر کے بھی دیکھ لو یہ بلینک وائس عشق تو اب بورنگ ہونے لگا ہے۔ ان آزاد جھوکریوں میں سوائے جنسی آسودگی کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا" اس نے سجاد کو سگریٹ آفر کرتے ہوئے کہا۔

"واہ واہ میاں تو سوچو ہے کھا کے حج کو چلے ہو اب ـــــ یہ لیلیٰ مجنوں کا عشق کرنے کی کب سے دھن ہوئی ہے، ہم تو اس سے نوسو کوس دور بھاگتے ہیں۔ ذات کو آہیں بھرو۔ دن کو فاقے مرو۔ چٹھیاں لکھو۔ ملاقات کے لئے ہاتھ جوڑو اور اگر قسمت تیز ہو اور ملاقات نصیب بھی ہو جائے تو دل ایسے دھڑکتا رہتا ہے جیسے ہچکی۔ لاحول بھیجو میاں۔ بیسویں صدی ہے یہ" سجاد نے ایک تقریر پلا دی

"سجاد بھئی اور تو کچھ نہیں اب ان ماڈرن گرل سے کوفت سی ہونے لگی ہے"

اس نے جواب دیا۔

"تو اس کوفت کا آپ عشق فرما کر علاج کر رہے ہیں"

"نہیں یہ بات نہیں ذرا سنجیدہ زندگی کا تجربہ بھی کرنا چاہتا ہوں"

"اور لاہور کا سنجیدہ عشق بھول گئے ہو —— اخباروں میں نام چھپ گیا تھا۔ دن رات گلی کے چکر ایسے پڑے رہتے تھے جیسے دھوبی کا کتا —— اور پھر جب ملاقاتیں شروع ہوئیں بنو کے بھائی صاحب نے —— دیکھوں ذرا سر —— ہاں یہ دیکھو ابھی تک بال نہیں اُگے —— بال تو بال نام بھی گیا —— چلو کے والٹی چلیں۔"

"وہاں جا کر کیا کرو گے اس وقت" اس نے پوچھا۔

"کے والٹی کی آئس کریم سے ذرا ٹھنڈا ہو جاؤں گا، عشق اور پھر وہاں بھی لطف آتا ہے" سجاد نے چٹخارہ لیا۔

"خاک لطف آتا ہے۔ کے والٹی والوں نے بالکونی میں زنان خانہ بنا دیا ہے وہاں ہمیں اجازت نہیں جانے کی —— اب لطف کیا آئے گا —— بس نیچے بیٹھے آئس کریم کھاؤ اور اوپر دیکھ کر گرم آہیں بھرو" اس نے اکتا کر کہا۔

"بھئی میں نے تو وقت دیا ہوا ہے" سجاد بولا۔

"کس کو" اس نے پوچھا

"اسی کو —— وہ جس کو دیکھ کر تم نے کہا تھا سجاد یہ ملجائے تو قربان کر دوں

خود کو۔

"کون ہے وہ ــــ مجھے تو یاد نہیں" اس نے حافظہ پر زور ڈالا۔

"ارے بھئی وہی ــــ زرینہ"

"تو پہنچ گئے تم"

"سجاد کو تم سمجھے نہیں کہو تو تارے توڑ لاؤں" اچھا اب اٹھو، وہ اٹھا کپڑے بدلے آئینہ دیکھا اور کے والٹی کی راہ لی۔

ریگل سینما کے سامنے کے والٹی ریسٹورنٹ کی ہرے رنگ کی بلڈنگ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی لائبریری ہو ــــ اجنبی لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ ریسٹورنٹ ہے جہاں کئی بچھڑے ہوئے جوڑے آکر ملتے ہیں جہاں کی آئس کریم کا مقابلہ شہر بھر میں کوئی نہیں کر سکتا اور وہاں کے بیرے۔ اگر اس کو کسی چیز سے نفرت تھی تو وہ کے والٹی کے بیرے کمبخت، جب دیکھتے ہیں کہ کوئی شریف آدمی اپنی ملنے والی کو لے کر آیا ہے تو بار بار آکر پوچھیں گے "صاحب کچھ اور" اور اگر آپ تنہا ہوں تو گھنٹوں بیرے کا پتہ ہی نہیں ــــ وہ دونوں ریسٹورنٹ کے اندر چلے گئے سائڈ کی کیبن میں زرینہ منتظر تھی ــــ زرینہ نے مسکرا کر سجاد کا استقبال کیا اور سجاد نے اس کا تعارف کرایا۔

"یہ ہے میرا دوست۔ اور آپ ہیں مس زرینہ" زرینہ نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا اور اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"کیا لاؤں صاحب" بیرا جو پہلے ہی تاک میں کھڑا تھا بول اٹھا۔

"کے والٹی ڈِ لائٹ"، سجاد نے آرڈر دیا۔

"کتنے صاحب"

"تین اور کتنے"، سجاد نے جواب دیا اور بیرا مسکرا کر چلا گیا۔

"زرینہ ایک بات کا خیال رکھنا یہ میرا دوست آج کل مشرقی عشق کر رہا ہے اور کہتا ہے مغربی ماحول سے اکتا گیا ہوں"

سجاد نے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مغربیت میں رکھا بھی کیا ہے۔ میں بھی کسی زمانے میں اس کی دلدادہ تھی"

زرینہ نے رعب گانٹھا۔

"سجاد نے غلط سمجھا ہے —— میں مغربیت سے اکتا یا تو نہیں ہوں صرف آب و ہوا تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ چند یوم کے لئے۔ لیکن مجھے ابھی سے محسوس ہو رہا ہے مشرقی آب و ہوا راس نہیں آئے گی مجھے۔ دم ابھی سے گھٹا جا رہا ہے"

"بیرا آئس کریم لے آیا۔ تینوں نے کھانا شروع کیا۔

"اس کے بعد کیا پروگرام ہے" زرینہ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"سینما"، سجاد بولا

"اور پھر"

"پھر ملیر کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں۔ چاندنی اور تم" سجاد نے چٹخارہ لیا اور زرینہ نے شرمانے کی کوشش —— اس کی یہ بناوٹی شرم۔ اس کو بہت بری لگ رہی تھی۔

"سجاد بیٹا کسی روز پکڑے جاؤ گے"، اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اماں ہٹاؤ کون پکڑا جائے گا ـــــ جیب میں روپے ہیں ـــــ بہت ہوگا دو چار خیرات کر دیں گے"، سجاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ کے والٹی سے اٹھے سینما پہنچے، سجاد نے حسب عادت سینما میں بھی زرینہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا وہ منع کرتا رہا مگر سجاد بہر حال سجاد ہی تھا ـــــ زرینہ بن بن کر بگڑتی رہی مگر سجاد کی دست درازی نہ رکی۔ سینما ختم ہوا تو یار لوگوں نے بیر کی بوتلیں لیں۔ کے والٹی کے بیرے کو "ٹپ" دیکر گلاس لے لئے ـــــ اور پھر کار کا رُخ ملمیر کی ویران سڑک پر کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان زرینہ تھی اور سجاد! ـــــ اور وہ ـــــ وہ دور بیٹھا تصور ہی تصور میں پردہ کے پیچھے جھانکنے کی سعی کرتا رہا

دوسرے دن وہ پھر بالکونی میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا ـــــ زندگی سمٹ کر پردہ پر آ اٹکی تھی ـــــ پردہ ہلتا مہندی لگا ہاتھ باہر نکلتا۔ آدھا چہرہ بھی نظر آجاتا مگر تا حال اس کے کل والے خط کا جواب نہ ملا تھا۔ صبح سے بیٹھا ـــــ دوپہر ہوگئی مگر چٹھی نہ پہنچی اس کا دل چاہا کہ اٹھ کر چلا جائے مگر ایک نامعلوم سی کشش تھی جو اس پردہ کے پیچھے چھپی تھی ـــــ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اور گذر گیا اور پھر اس نے دیکھا کہ وہی مہندی بھرا ہاتھ باہر نکلا ایک کاغذ کی گولی نیچے آگری، اس نے نوکر کو بھیج کر وہ گولی منگوالی۔ لکھا تھا۔

تمہارے دل میں چور ہے، تم تک چھپا گئے ہو۔ کیا کبھی کوئی

چوروں سے بھی ملاقات کرتا ہے ... دن بھر بیٹھے رہتے ہو

گھر میں سب کو شبہ ہونے لگا ہے۔ کاش کہ تم نہ بیٹھتے۔ کاش کہ تم نہ بیٹھا کرو . . . .

تمہاری

بانو

" اس نے خط ختم کیا ہی تھا کہ سجاد آگیا۔

" اوہو ـــ شروع ہو گیا یہ سلسلہ ـــ بھئی میری سنو تو باز آجاؤ۔ شریف زادیوں سے کھیل خطرناک ہوتے ہیں" سجاد نے نصیحت کی۔

" سجاد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق کا مذاق اڑانے والا خود شکار ہو گیا" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

" تم بھی نرے اُلّو ہو" رات زرینہ کہہ رہی تھی کہ یہ تو بالکل بچہ ہے" سجاد بولا۔

" ہاں اس بچے کے ساتھ رات بسر نہیں کی ورنہ نہ کہتی خیر مجھے تمہاری اس زرینہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بناوٹ، تصنع اور ہوس کتنا بھونڈا پن تھا اس میں۔ مجھے اسی لئے ان چھوکریوں سے کوفت ہوتی ہے جو سمجھتی ہیں کہ تم ان کی اس بناوٹ کو شرافت سمجھو گے ـــ نان سینس" اس نے چٹھی کو موڑتے ہوئے کہا۔

" اچھا چھوڑو تم تو ہمیشہ یہی بحث کرنے لگتے ہو ـــ روفی بھی کہہ رہی تھی کہ سجاد تمہارا یہ ساتھی تو بور ہونے لگتا ہے ـــ"

" روفی کہہ رہی تھی ـــ" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں"

"خیر ہوگا مگر مجھے تو یہ معلوم ہے کہ بال رُوم میں وہ سوائے میرے کسی کے ساتھ رقص نہیں کرے گی ——"

"یہ علیحدہ بات ہے کہ تمہارا رقص اسے پسند ہو۔ مگر رات کو کلفٹن وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی"

"اور پچھلے ہفتے کس کے ساتھ گئی تھی وہ" وہ بولا

"تمہارے ساتھ تھی کیا؟" سجاد نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہوں"

"بڑی خرانٹ ہے میں نے کہا کہ "نیچ لگزری" چلیں گے تو کہنے لگی کہ ڈیڈی کے ساتھ سنٹرل میں جانا ہے" سجاد کو غصہ آگیا۔

"سجاد تم تو صرف زرینہ جیسی لڑکیوں سے کھیل سکتے ہو ان ماڈرن لڑکیوں کو سمجھنا تمہارے بس کا روگ نہیں"

"خدا محفوظ ہی رکھے ہمیں تو ملیر اور ہاکس بے ہی پسند ہے ——"

سجاد نے کہا اور چلا گیا۔ وہ بیٹھا رہا چھٹیاں آتی رہیں جاتی رہیں —— اور اس کا عشق سر چڑھ کر بولنے لگا۔ بالکونی تھی اور وہ پردہ تھا اور مہندی لگا ہاتھ —— ہفتہ گذر گیا —— مگر سوائے چھٹیوں کے اور آگے نہ بڑھ سکا۔ اب انگلیاں تھک گئی تھیں وہ اکتا گیا تھا اس دور افتادہ عشق سے جس کے لئے گھٹ گھٹ کر مرجانا پڑتا ہے شام ہوگئی تھی، اس نے ڈریس سوٹ پہنا۔ آج جیمخانہ میں ڈانس تھا۔

مس درانی نے دعوت دی تھی۔ اس کے کالج کی ساتھی مس درانی جو ساری عمر شادی کے بجائے رقص کرتے رہنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ بالکل تیار ہو چکا تھا ـــــ مگر نیچے سجاد کی کار نے چونکا دیا ـــــ "اب خیر نہیں" اس نے سوچا۔

"اکیلے ہی اکیلے سیلفش کہیں کے" سجاد نے آتے ہی جھاڑا۔

"بھئی اپوائنٹمنٹ ہے آج" وہ منت سے بولا۔

"میری بھی ہے"

"تمہاری تو روز ہوا کرتی ہے" وہ بولا

"نہیں آج خاص ہے۔ ایسی چیز ہے کہ تم بھی یاد کرو" سجاد نے اس کو کندھے سے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی خدا کے لئے آج مجھے معاف کر دو ـــــ" اس نے پھر منت کی۔

"آج نہیں اللہ قسم تم بھول جاؤ گے۔ ڈالنس والنس" اس نے اسکو گھسیٹا اور اس کو جانا ہی پڑا۔ مایوسی سے وہ کار پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے" اس نے پوچھا۔

"وہ پہنچ چکی ہوں گی" سجاد نے کار کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر کہاں"

"گرینڈ ہوٹل ملیر"

"تمہارا ملیر جائے گڈھے ہیں" کمبخت گورنمنٹ نے پروہبشن کر دیا ہے اور تمہارا ملیر بغیر لائسنس کے چل رہا ہے"

"ہم پہلے ہی وہاں نہیں جاتے تھے جو ہمیں فکر ہو" سجاد بولا اور کار تیزی سے ملبر کی سڑک پر اڑی جا رہی۔ گرینڈ ہوٹل کے سامنے سائڈ پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی اور اس کے اندر ایک سیاہ برقعہ بیٹھا ہوا تھا۔

"سجاد اتر کر گیا اور برقعہ نیچے اتر کر اس کی طرف بڑھا، سجاد نے اپنی کار کا دروازہ کھولدیا اور وہ اندر بیٹھ گئی۔

"یہ ہیں میرے دوست —— اور یہ ہیں آپ کی —— کیا نام ہے آپ کا" سجاد نے پوچھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے آپ تو شرما رہی ہیں برقعہ اٹھا دیجئے" سجاد نے بڑھ کر برقعہ اٹھا دیا اور اس نے دیکھا ایک مہندی لگے ہاتھ نے اپنا منھ ڈھانپ لیا۔

"آپ" وہ بوکھلا گیا "یعنی کون" سجاد سوالیا نشان بن گیا۔

"سجاد مجھے واپس لے چلو خدا کے لئے واپس لے چلو مجھے مشرقی عشق سے نفرت ہے اس پردہ سے نفرت اس مہندی لگے ہاتھ سے نفرت ہے۔ کمینے لوگ" وہ سجاد کی کار سے اتر کر ٹیکسی میں جا بیٹھا اور ٹیکسی چلی گئی۔

نیا فساد

"تمہیں معلوم ہے بینو اب ہم آزاد ہو جائیں گے۔ صدیوں کی غلامی کے بعد ہمارے سانس آزادی میں چلیں گے اور آزادی کے ساتھ،" اس نے اپنی چھ مہینے کی ننھی کو پیار کرتے ہوئے اپنی بیگم سے کہا۔

"ہاں صدیوں کی غلامی کے بعد،" آمنہ نے جواب دیا۔ ایسے جیسے وہ کچھ بھی نہیں سمجھتی۔

"یہ گورے گورے لوگ اب ہمیں ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔

"اور پھر کیا ہوگا،" آمنہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا ہوگا۔ تم بھی کتنی بھولی ہو ——— ہاں کیوں نہ ہو تم نے آزادی کو دیکھا ہی نہیں تم نے جب سے آنکھ کھولی ہے ——— تم غلام تھیں ہم سب غلام تھے۔ ہم۔ ہماری زبانیں۔ ہمارا پریس۔ سب غلام تھے پھر بھلا تمہیں اور مجھے آزادی کا کیا پتہ۔ پیدائش سے جیلخانے میں رہنے والا انسان کیا جانتا ہے سلاخوں کے پیچھے کیا ہے" اس نے ایک سرد آہ لے کر کہا۔

"پاکستان کہاں بنے گا،" آمنہ نے پوچھا۔

"پگلی ——— دیکھا نہیں تم نے نقشہ سارا بنگال اور سارا پنجاب پاکستان ہی تو ہے بس اب باؤنڈری کمیشن نے نشان لگانے ہیں۔"

"اور اگر باؤنڈری کمیشن نے امرت سر کو بھی ہندوستان میں ملا دیا تو"

"پاگل ہوئی ہو مسلمان کبھی نہیں مانیں گے" اس نے جوش سے کہا۔ اور دونوں آزادی کے دن کا انتظار کرنے لگے — انتظار غلامی سے نکل بھاگنے کا انتظار۔ عمر قید سے چھٹ جانے کا انتظار — اس کو محسوس ہوا کہ دنیا بدل گئی ہے — بھوک مٹ گئی ہے لوگ مسرت سے ناچ رہے ہیں — آزادی کے گیت گا رہے ہیں — اور وہ سینہ تان کر باہر چلا گیا۔ اور پھر یکایک آزادی قریب آنے لگی — اتنی قریب کہ امرت سر میں بھی آ گئی مسلمانوں نے سکھوں کی گردنیں ناپنی شروع کر دیں اور سکھوں نے مسلمانوں کی۔ آزادی قریب آ رہی تھی سکھوں کے محلوں سے مسلمان بھاگ بھاگ کر ایک مرکز پر جمع ہو رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے" آمنہ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کیا ہو رہا — سکھوں کا دماغ پھر گیا ہے اب مسجد شہید گنج کے بدلے لئے جائیں گے۔ سالے سکھستان مانگتے تھے، کچھ دن مسلمانوں کا عروج رہا دل کھول کر سکھوں کو کاٹا غنڈوں نے ہاتھ رنگے — ہر طرف ایک طوفان تھا۔ انقلاب تھا — آزادی مادر زاد چلی آ رہی تھی ننگ دھڑنگ آزادی! — اور پھر پانسہ پلٹ گیا۔ ہندوستانیوں کی فوج نے امرت سر پر قبضہ کر لیا۔

"میں نہ کہتی تھی کہ امرتسر بھی ہندوستان میں چلا جائیگا" آمنہ نے سامان باندھتے ہوئے کہا"

"باؤنڈری کمیشن نے حرامزدگی کی ہے" اس نے جواب دیا اور اپنے گھر کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہی تو کیا ہے،" آمنہ نے کہا مگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

سامان باندھا جا چکا تھا کچھ آمنہ نے اٹھایا اور کچھ اس نے وہ باہر نکل کھڑے ہوئے قافلے کے قافلے چلے جا رہے تھے اس طرح جیسے وحشت زدہ جانور۔ بھیڑیں۔ سب پیچھے مڑ مڑ کر تک رہے تھے۔ اور پیچھے سکھوں کی یلغار۔ وہ بے تحاشہ بھاگے تمام راستہ۔ رنجیدہ چہروں سے پٹا پڑا۔ رنجیدہ اور آزاد چہروں سے نعروں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، بچے بلبلا رہے تھے، عورتیں چلا رہی تھیں۔ اور یکایک یلغار قریب آگئی۔ سب لوگ جدھر راہ ملی بھاگ نکلے، دائیں بائیں آگے پیچھے۔ آمنہ شوہر کا دامن پکڑے بھاگی جا رہی تھی ننھی زور زور سے چلا کر اب چپ ہو چکی تھی جو سامان وہ لائے تھے اس میں سے آدھا باقی بچا تھا۔ ان کے سامنے لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ننگی عورتوں کے جسم تھے اور آزادی کھڑی کھلکھلا رہی تھی، سوراج مسکرا رہا تھا اور غلامی کے لبوں پر دھول جم گئی تھی اور پھر وہ رک گیا آمنہ رک گئی سامنے ایک لاری آکر کھڑی ہو گئی اس میں سے دو سکھ نوجوان کود پڑے وہ انہیں دیکھ کر بے تحاشہ بھاگا۔ آمنہ ٹھوکر کھا کر گری اس کے ہاتھ سے بچی دور سڑک کے کنارے اوندھی جا پڑی تھی اس کا دل چاہا کہ واپس جا کر یا مر جائے یا مار ڈالے اس نے کچھ سوچا اور لاری کی طرف دوڑا۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک ہجوم میں پایا زخمیوں اور مردوں کے ہجوم میں اس کے کندھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اس کو آمنہ کا خیال آیا اپنی ننھی کا خیال آیا اور اس کو محسوس ہوا کہ دنیا میں صرف وحشی ہی رہتے ہیں اور وہ خود بھی ایک وحشی تھا "اب مسجد شہید گنج کا بدلہ لیا جائیگا،"

اس کو اپنے منھ سے نکلے ہوئے لفظ اس گولی کے درد سے زیادہ تیز معلوم ہونے لگے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی طرح ہزاروں لوگ پڑے تھے ـــــ اور شائد وہ سب کے سب اپنی اپنی آمنہ اور ننھی کے متعلق سوچ رہے تھے۔

دوسرے دن اسپیشل میں سوار کرا کر ان کو لاہور بھیجدیا گیا۔ لاہور پہنچکر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند دن بعد اس کے زخم ٹھیک ہو گئے مگر اس کے دل کے زخم ـــــ اس نے بازاروں میں اِدھر اُدھر دیکھا شائد کوئی سکھ نظر آجا مگر اس کو مایوسی ہوئی وہ بدلا نہیں لے سکتا تھا وہاں بدلا لیا جا چکا تھا ـــــ وہاں سے بھی اسپیشل ٹرین جا رہی تھی امرت سر کی طرف۔ امرت سر سے لاہور اور لاہور سے امرت سر آزادی چکر لگا رہی تھی ـــــ

ہر طرف ہنگامہ تھا آہیں تھیں ـــــ پھیکی پھیکی مسکراہٹیں تھیں خالی خالی قہقہے تھے اب وہ مہاجر تھا مگر کتنا فرق تھا مکّہ کے مہاجر اور اس میں۔ وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا امرت سر کے کٹڑہ بازار میں اس کی کپڑے کی دوکان تھی اور یہاں بھی اس کو کپڑے کی دوکان کی فکر تھی آمنہ اور ننھی کی جگہ اب پیٹ نے لے لی تھی، چند ماہ تک وہ کسی نہ کسی طرح پیٹ پالتا رہا۔ جب حالات ذرا درست ہوئے تو اس نے تانگا چلانا شروع کر دیا۔ کپڑے کے تھانوں کی جگہ اس کے ہاتھوں میں گھوڑے کی باگیں تھیں کوئی پروا نہیں۔ آمنہ اور ننھی کے بجائے آزادی تھی تو بھلا وہ غلامی کے دور کا کاروبار کس طرح کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی جب اسے تانگا چلاتے چلاتے آمنہ کا خیال آتا تو اس کا کلیجہ جلنے لگتا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیوں میں ایک تناؤ پیدا ہوتا اور وہ گھوڑے کو

کس کر چابک رسید کرتا۔ اور جب رات کو وہ اپنے اڈے پر پہنچتا گھوڑا کھولتا اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتا اور پھر اس کو نہ جانے کیا ہو جاتا وہ گھوڑی کی گردن میں باہیں ڈال کر خوب روتا۔

ایک سال گذر گیا اس کے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے لوگ فساد کو بھول کر اپنی اپنی زندگی کے لئے مستقبل تعمیر کرنے لگے۔ وہ لاہور سے اکتا گیا تھا اور پھر وہ ایک دن کراچی میں آپہنچا ــــ یہاں بھی مہاجرین تھے انصار تھے مگر سب خشک سوکھے ہوئے، دونوں کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ماضی کے دریچے نظر آتے تھے اس نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کپڑا بیچنا شروع کر دیا ــ اور جب وہ کپڑا ناپ کر گاہک کو دیتا تو اس کا دل آمنہ اور ننھی کو بری طرح محسوس کرتا ــــ وہ کبھی کبھی ناپنے میں بھی غلطی کر جاتا۔

"ارے میاں ناپ میں چوری کرتے ہو ــ پکڑوا دونگا" گاہک غصّے سے کہتا۔

"بابو صاحب غلطی ہو گئی ہے دوسرا دیئے دیتا ہوں" وہ التجا کرتا۔

دن گذر رہے تھے عورتوں کی بازیابی کی مہم شروع ہو گئی تھی وہ روز اخبار پڑھتا۔ ریڈیو کا اعلان سنتا حاصل شدہ عورتوں کے نام سنتا مگر آمنہ کا نام اس کو کہیں نہ ملتا ایک دو دفعہ پڑھا اور اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی مگر جب وہ ولدیت اور شوہر کا نام پڑھتا تو مایوس ہو جاتا اور اب تو وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ زندگی میں بہت خلا تھا جس کو وہ کپڑے کے تھانوں سے بھی پُر نہ کر سکا۔ شہر میں یہ افواہیں گشت کر رہی تھیں بازیافتہ لڑکیوں کو ان کے وارث لینے کے لئے

تیار نہیں ہو رہا ہے۔

"کمینے!" وہ گالی دیتا "یہ لوگ کتنے بد اخلاق ہیں اگر ان کی بیٹیوں کو کافروں نے رکھا تو ان میں ان کا کیا قصور تھا۔ کیا وہ خود گئیں تھیں" اور پھر اس کو امرت سر کا وہ نظارہ یاد آجاتا جب اس کی آمنہ کو دو سکھوں نے اٹھا کر لاری میں ڈال لیا تھا اور اس کی ننھی! اس کے دل سے ٹیس اٹھتی۔ کتنی پیاری تھی وہ جیسے سورج مکھی کا پھول جب کٹڑہ بازار سے وہ دوکان بند کر کے گھر لوٹتا تو سب سے پہلے ننھی کو پیار کرتا۔ آہ ننھی اور آمنہ ـــــ "اور اب یہ کمینے لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو واپس لینے سے انکار کرتے ہیں ـــــ دھوکہ باز کتے" وہ دل کھول کر گالیاں دیتا ـــ کئی دفعہ اس سے بوڑھے رمجو سے بحث ہو گئی اس کی بھی دو بیٹیاں سکھوں نے چھین لی تھیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے ان کی بے عزتی کی تھی اور بوڑھا رمجو آنکھیں بند کئے کھڑا رہا تھا۔ مجبور اور مایوس۔

"خدا ان کو وہیں مار دے" بوڑھا رمجو اکثر دعا مانگا کرتا۔

"کیوں بڑے میاں" وہ پوچھتا۔

"ہاں بیٹا وہ چھوریاں اب مجھے اپنی شکل کیسے دکھا سکتی ہیں۔ اور پھر میں ان کو واپس اپنے پاس رکھ کر اپنا منہ کس طرح چھپا سکتا ہوں" بوڑھا درد اور کرب سے جواب دیتا اور اس کے دل میں آگ لگ جاتی۔

"پاگل ہوئے ہو بڑے میاں ـــ آخر تمہاری بیٹیاں تھیں وہ اگر کافروں نے اپنا منہ کالا کیا تو ان بیچاریوں کا کون سا قصور تھا" وہ کہتا اور بوڑھا سوچ میں پڑ جاتا۔

دو دن بعد اس نے اخبار میں پڑھا۔

رابعہ عمر ۱۸ سال ولد رمجو　　　　سکینہ عمر ۲۲ سال ولد رمجو

یہ لڑکیاں ان پچاس بازیافتہ لڑکیوں کے ساتھ لاہور کیمپ میں آئی ہیں، اس نے خوشی سے اچھل کر رمجو کو خبر سنائی۔ چند لمحوں کیلئے بوڑھے کے لبوں پر مسرت کی پدرانہ چمک پھیل گئی اور پھر اسکی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل آئے، دوسرے دن وہ رمجو کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آیا۔ ہفتہ گذر گیا۔ رمجو بھاگ گیا تھا اپنی لڑکیوں سے خوف کھا کر اور اس کا دل چاہا کہ رمجو کو پکڑ کر خوب مارے —— اور وہ کپڑا ناپنے کے گز سے تھانوں کو پیٹتا رہا۔ دن گذر رہے تھے، پیٹ میں دانا پڑ رہا تھا۔ جوان تھا رات کی تنہائیاں چبھنے لگیں، ہوٹلوں کا کھانا برا لگنے لگا —— اب اس کو شادی کر ہی لینا چاہئے ——" ایک دو دوستوں سے بات کی لڑکیوں والے تو پہلے ہی بیچارے منتظر تھے ایک نہیں کئی کئی پیچھے لگ گئے —— آخر ایک ادھیڑ عمر غریب مہاجر سے بات پکی ہو گئی —— چار پانچ آدمیوں کو پکڑ بوڑھے کی بیوہ بیٹی سے نکاح کر لیا۔ نئی بیوی کو گھر لایا اسکی گود کا بچہ اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اس کی ننھی کی جگہ یہ بچہ جوان ہو کر اس کے بڑھاپے کا سہارا ہو گا۔ اس نے نئی بیوی کا گھونگھٹ اٹھایا۔

"آمنہ!" اس کے منہ سے نکلا اور مرجھائی ہوئی آمنہ کی بے نور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

"تم —— تم اور یہ بچہ —— اُف یہ ان کافروں کی نشانی ہے۔ نہیں کبھی نہیں ایسا نہیں ہو گا —— کبھی نہیں ہو گا" وہ بچے کو زمین پر بٹھا کر بے تحاشہ بھاگا۔ بہت زور سے اس کو محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے فساد لپکا چلا آ رہا ہے، نیا فساد۔ بازیافتہ بیویوں کا فساد —— لٹی ہوئی عصمتوں کا فساد۔ چھنی ہوئی بہنوں کا فساد۔ وہ بھاگا جا رہا تھا اس کے پیچھے بوڑھے رمجو کی روح قہقہہ لگا رہی تھی۔ آزادی اور انسانیت دور کھڑی سسکیاں بھر رہی تھی ——"

اور وہ روتی رہی

"جب نسرین کے ابا کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی بھتیجی بی اے کرتے کرتے عشق کرنے لگی ہے تو ان کو فوراً سماج خطرہ میں محسوس ہونے لگا۔ کہاں یہ فکر کہ بچی کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھیجا جائے گا ڈاکٹری کی تعلیم دلوائی جائے گی، یہ کیا جائے گا وہ کیا جائیگا۔ جب نسرین کے ماموں جان نے اپنی ہمشیرہ کے بائیں کان میں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ تمہاری لاڈلی تمہارے حریف کے فرزند ارجمند کے لڑکے سلیم سے عشق فرما رہی ہے تو بیگم صاحبہ کا پان گلے میں اٹک کر رہ گیا قریب تھا کہ ان کی آنکھیں نکل آتیں کہ بھائی صاحب نے ٹھوک بجا کر مزاج ٹھکانے لگا دیا۔

"اللہ مارے ان چھوکروں کو ذرا بھی دید نہیں، کیا گھر میں کوئی ماں بہن نہیں تھی جس سے جا کر کلیجہ ٹھنڈا کرتا۔ . . . . . اللہ رکھے میری بچی تو ابھی سیدھی سادی ہے" بیگم کو ابال بھی آیا تو مردوں پر!

"بھئی اس میں سلیم کا کیا قصور،" ماموں جان نے بے سوچے سمجھے مردوں کی وکالت کر دی"

"تو پھر کس کا قصور ہے ، بیچاری تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی کسی کو۔ اسی کلموئے نے کچھ پڑھایا ہوگا"

"خیر کچھ بھی ہو اب ان باتوں کا وقت گیا۔ آگے کی فکر کرو بہن!" ماموں جان